

قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد، دکن سے ماہانہ ادبی مجلہ.....

انوار تحقیق

زرتعاون کا ذریعہ:
Mr. Mubarak Hussain
Accnt no.: 50045054076
IFSC CODE: ALLA-0210134
Allahabad Bank, AMU, Aligarh

جلد ۲ شماره ۵، ۴، ۳ مارچ، اپریل، مئی ۲۰۱۶ء

زرتعاون: فی شماره: ۵۰ روپے سالانہ: ۵۰۰ روپے

نگراں: سید عادل احمد، محکمہ آثار قدیمہ، اسٹیٹ میوزیم، حیدرآباد، تلنگانہ

ایڈیٹر: سید الیاس احمد مدنی

پتہ: 9/10/389، نیم باولی مسجد، کٹھوراہاؤس، گولکنڈہ قلعہ، حیدرآباد، تلنگانہ۔ 500 008

موبائل نمبر: 09966647580 ای میل: anwaretahqeeq@gmail.com

مجلس مشاورت

پروفیسر مسعود انور علوی - شعبہ عربی، اے ایم یو، علی گڑھ
پروفیسر عمر کمال الدین - شعبہ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
پروفیسر سید حسن عباس - شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی
پروفیسر عزیز بانو - شعبہ فارسی، مانو حیدرآباد
پی انورا دھاریڈی - انٹیک، تلنگانہ اسٹیٹ، حیدرآباد - چائپر
ڈاکٹر زرینہ پروین - ڈائریکٹر آف آرکائیوز، حیدرآباد، دکن
ڈاکٹر سید محمد اصغر عابدی، شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ
احمد علی، کیپر مینسکر پٹ - سلار جنگ میوزیم، حیدرآباد
ڈاکٹر سیدہ عصمت جہان - شعبہ فارسی، مانو حیدرآباد
ڈاکٹر ایم اے نعیم، حیدرآباد، دکن
جناب ایم اے غفار، استاد خطاطی، ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد
کشور جھن جھن والا، ماہر مسکوکات، ممبئی
امر بیر سنگھ - ماہر مسکوکات - حیدرآباد

مجلس ادارت

ڈاکٹر شاہد نوخیز اعظمی - شعبہ فارسی، مانو حیدرآباد
ڈاکٹر محمد عقیل - شعبہ فارسی، بی ایچ یو، وارانسی
ڈاکٹر سکینہ امتیاز خان - صدر شعبہ فارسی، بمبئی یونیورسٹی، ممبئی
ڈاکٹر محمد قمر عالم - شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ
ڈاکٹر محمد توسیف خان کاکر - شعبہ فارسی، اے ایم یو، علی گڑھ
احمد نوید یاسر از لان حیدر
مدیر سہ ماہی ادبی جریدہ ”دبیر“ - کاکوری، لکھنؤ
ارمان احمد
مدیر سہ ماہی ادبی جریدہ ”عرفان“ - چھپرا، بہار
عاطفہ جمال
مدیر سالنامہ ”لوکب ناہید“ سندیلہ، ہردوئی
شیخ عبدالرحیم - جماعت اسلامی ہند - حیدرآباد، دکن
متی علی خان - نامہ نگار روزنامہ منصف، حیدرآباد، دکن

فہرست مندرجات

صفحہ	مقالہ نگار	عنوان
3	مدیر	۱۔ ادارہ
۴	ڈاکٹر خدیجہ جبین	۲۔ صحیح عمل المرأة
۶	محمد ریاض	۳۔ عہد شہمیر یان، نخستین دورہ فارسی در کشمیر
۱۱	شبیر احمد و لطیف احمد	۴۔ غنی و رزندہ فقر
۱۵	ڈاکٹر عالم اعظمی	۵۔ غربت میں جا کے چمکے
۱۹	لطیف احمد سلمانی	۶۔ ہدایت المخلصین کا جمالی تعارف
۲۳	شفیق احمد	۷۔ ملا بہاؤ الدین متو
۲۷	تبسم رفیع	۸۔ عہد مغلیہ کے تین سلاطین
۳۳	یاسر عباس	۹۔ استناد قمر جلالوی کی مرثیہ نگاری
۴۰	رضیہ سلطانہ	۱۰۔ مولانا شبلی نعمانی کی تاریخی تصانیف پر ایک نظر

اداریہ

اونچی عمارتیں، عالیشان تعمیرات کا تذکرہ کرتے ہی ہمارے ذہنوں میں دیئی کے فن تعمیر کے نقوش ابھرنے لگتے ہیں کیوں کہ اس عصری دور میں یہاں فلک بوس عمارتیں دیکھنے کے بعد عقل حیران رہ جاتی ہے لیکن اگر ہم تاریخی شہر حیدر آباد میں موجود حضرت سید شاہ راجو قتال محمد الحسینیؒ کی درگاہ کی فن تعمیر کا تذکرہ کریں تو دنیا بھر کی عالیشان عمارتیں ہیچ دکھائی دیتی ہیں کیوں کہ 350 برس قبل صرف ایک چٹان میں 110 ستونوں پر تعمیر کردہ یہ گنبد فن تعمیر کا انتہائی غیر معمولی نمونہ ہے۔ ویسے تو شہر حیدر آباد میں کئی بزرگان دین کی مزارات اور بارگاہیں موجود ہیں لیکن سید یوسف حسینیؒ جنہیں یہاں کی عوام انہیں شاہ راجو قتال کے نام سے جانتی ہے ان کی آخری آرام گاہ جو کہ مصری گنج میں موجود ہے یہ فن تعمیر کی ایک ایسی شاندار عمارت ہے جسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ حضرت سید راجو قتالؒ جو کہ قطب شاہی سلطنت کے آخری بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ کے استاد و مرشد بھی رہے اور 14 برس بادشاہان کے فیوض و برکات سے مستفیض بھی ہوئے اس عقیدت کے تحت قطب شاہی دور میں یہ گنبد تعمیر ہوئی ہے۔ یہ گنبد جو کہ ہندوستان کا سب سے اونچا گنبد ہے اس کی تعمیر میں 110 ستونوں کا سہارا لیا گیا ہے اور ہر ستون ایک ہی پتھر میں تراشا گیا ہے یعنی ان ستونوں کے لیے 110 بڑی چٹانوں کو تراشا گیا اور ہر چٹان کو کانٹ چھانٹ کر ایک ستون بنایا گیا ہے۔ سطح زمین سے اس گنبد کی اونچائی 165 فیٹ ہے۔ ایک بزرگ ہستی کی آخری آرام گاہ اور فن تعمیر کی شاہکار کے اعتبار سے ایک غیر معمولی عمارت کی خستہ حالی کی طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے کیوں کہ گنبد پر جگہ جگہ گچی کرنے سے اس کی بوسیدگی کا پتہ چل رہا ہے۔ چند برس قبل قلی قطب شاہ اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی نے اس درگاہ کے اندرونی حصہ میں آہک پاشی کا کچھ کام کروایا تھا لیکن بیرونی حصہ کی خستہ حالت کو سدھارنے کی سمت کسی نے توجہ نہیں کی۔ اکتوبر 2006 میں 2 ہزار کروڑ روپے کے خصوصی پیکج کے اعلان کے باوجود ہندوستان کی سب سے اونچی گنبدزبوں حالی کی شکایات کر رہی ہے۔

صحة عمل المرأة

ڈاکٹر خدیجہ جبین، پی ایچ ڈی عثمانیہ یونیورسٹی، اسسٹنٹ پروفیسر جامعہ نظامیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

قال تعالى: (وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى وأقمن الصلاة...) وقال رسول الله ﷺ (وبيوتهن خير لهم) وعن أنس قال جئن النساء الى رسول الله ﷺ وقلن: يا رسول الله ﷺ ذهب الرجال بالفضل والجهاد في سبيل الله فمالنا من عمل ندرك به عمل المجاهدين في سبيل الله؟ فقال رسول الله ﷺ من قعدن منكن في بيتها فإنها تدرك عمل المجاهدين في سبيل الله) وقال الرسول ﷺ إن المرأة عورة فإذا خرجت ضحك منها الشيطان وأقرب ما تكون قريبة من ربها وهي في قعر بيتها) وفي الحديث صلوة المرأة في مخدعها أفضل من صلاتها في بيتها وصلاتها في بيتها أفضل من صلاتها في مجرتها)

إن جلوس المرأة بين جدران بيتها لا يقل عند الله عن الجلوس بين جدران بيت الله وإن سعيها بين مخدعها ومطبخها لا يقل عند الله عن السعي بين الصفا والمروة، وإن جلوس المرأة في بيتها بمثابة عداد يعد الحسنات فإذا خرجت من بيتها توقف العداد.

إن المرأة المؤمنة التي تقر في بيتها تثاب لامتناعها لأمر الله بالقرار في البيت، وعزتها في تذللها لزوجها في طاعة الله، وأمان المرأة في أن ينفق عليها زوجها ويزول هذا الأمان بانفاق المرأة على نفعها وتجد الغنى في انفاق زوجها عليها وتجد الهواء الطلق في نفوس أولادها ورائحة طيبخها.

ولا تكلف المرأة بشئ من الانفاق. سواء كانت غنية أو فقيرة، سواء زوجها قادرا على العمل أو عاجزا عنه بل ذكر الفقهاء أن الزوج الغير القادر على العمل تكلف بالسؤال لينفق على زوجته.

فالبيت بدون الامهات الصالحات قبور والبيت بلا زوجة كالمسجد لا تقام فيه صلاة، ولو علمت المرأة ثواب جلوسها في بيتها ما خرجت من بيتها الا ثلاث مرات: مرة من بيت أبيها الى بيت زوجها، ومرة من بيتها الى المسجد الحرام لاداء فريضة ربها، ومرة من بيتها الى قبرها.

فلا تخرج الا لحاجة وليس حاجتها طلب الرزق فانها مكفية الرزق من والدها أو زوجها أو أخيها أو أبنائها أو قريبها ولها أن تعمل في مساعدة زوجها وأبيها في الخياطة والتطريز وأن تتاجر بمالها، لان لها الشخصية المستقلة ولها أعمال تناسب مع فطرتها وتستطيع مشاركة الرجل في أمور الحياة.

وإذا خرجت فعليها أن تراعي مايلي:

- إذن وليها في الخروج الى العمل.

-سلامتها من الاختلاط والخلوة بالأجنبي .
- خروجها من بيتها عن أمر اسلامي من جلباب سايع وستر للوجه والكفين .
- ويحسن خروج المرأة من البيت الا لحاجة ماسة اليها .
ولا بد لها من مخالطة الرجال وذلك أمر محرم والمرأة التي تعمل خارج البيت تفقد أنوثتها ويفقد أطفالها الثمن الحب .
والمرأة لا تستطيع أن تنجز أعمالا كالرجال فإن لها من العادات الشهرية وأعباء الحمل والفكر في الاولاد وفي تربيتهن ومطالبهم ما يغشها حقا ان توازي الرجل في عمله ويعوقها عن التقدم في العمل .
فمن خلال ما عرضنا من طبيعة المرأة ووظيفتها في الحياة نستطيع أن نقرر بسهولة وإيجاز أن العمل الذي يجب أن توجه إليه جهود الأباء ومسؤولي التربية والإعلام في حق الأنثي هو العلم الذي يتفق مع طبيعة الأنثي ووظيفتها في الحياة .

يجب أن تُعَلِّم الدروس الدينية من قرآن وسنة وتوحيد وفقه وكذلك يجب أن تُكثِّر لها من دروس التربية والاخلاق لكي تربي أولادها في المستقبل ويجب أن تكثِّر لها دروس العناية بالأسرة ووظائف أعضائها وواجباتها نحو زوجها وبيته وأولادها ويجب أن تكثِّر لها دروس العناية بتربية الأطفال تربية سليمة من جهة الخلق والجسم والعقل ويجب أن تكثِّر لهما دروس تتعلم بها أعمالا تتفق مع وظيفتها من خياطة وتطريز . وتوجه بعضهن الى متابعة الدراسة العالية كي يخرجن قابلات ممرضات وطبيبات ومعلمات ومدرسات يعملن في المدارس ويجب مراعاة عدم الاختلاط قدر الإمكان لأضراره البالغة والخطيرة .

عهد شہمیریان، نخستین دورہ فارسی در کشمیر

محمد ریاض (ریسرچ اسکالر)، شعبہ فارسی، اے، ایم، یو، علیگڑھ

قبل از عهد شہمیریان در سرا سر کشمیر سانسکریت از حیث زبان موثق و رسمی رائج تمام بود و زبان فارسی را فقط بازرگان و تاجران و یا سیاح کہ از کشور ایران بہ خطہ کشمیر ورود می کردند بہ کار می بردند۔ وقتی کہ پادشاہ رنچن فوت شد، شخصی بنام شہمیر بغاوت کرد تا در سنہ ۱۳۳۸ء بالقب سلطان شمس الدین بہ حکومت نشست۔ عهد شہمیریان در کشمیر از دورہ سلطان شمس الدین شہمیر شروع می شود و بعد از این بیشتر آل شہمیریان کہ اسمشان سلطان جمشید، سلطان علاء الدین، سلطان شہاب الدین، سلطان قطب الدین، سلطان سکندر و سلطان زین العابدین آمدند در کشمیر حکومت کردہ اند۔^۱

انتشار و ترویج زبان و ادبیات فارسی و تعلیمات اسلامی در خطہ کشمیر اصلاً نتیجہ فتنہ تیموری در ایران بود۔ وقتی کہ چون بلادہای قرب و جوار کشور ایران از فتنہ تیموری ویران گشتند، ہزارہا مردم از این سبب از کشور ایران جوق در جوق بہ ہجرت مجبور شدند۔ مورخین می نویسند کہ میر سید علی شاہ ہمدانی ابن شہاب الدین ہمدانی از سبب ہمین فتنہ تیموری در دورہ سلطان شہاب الدین شہمیر در سال ۷۷۳ ہجری اولین بار بہ خاک کشمیر قدم مبارک نہادند و بار دوم سید علی ہمدانی در دورہ سلطان قطب الدین در سال ۷۸۱ھ با ہفتصد سادات کرام کہ بیشترشان شاعران و علمای دین بودند باز در کشمیر وارد شدند، بار سیوم در سال ۷۸۵ھجری در کشمیر آمدند۔ بعد از این سلسلہ ای بہ اینطور جاری ماند کہ پسر شاہ ہمدان بنام ”سید محمد ہمدانی“ با صدہا سادات کرام ہم وارد کشمیر شدند و اثر براہ راست این شد کہ با انتشار و تبلیغ دین اسلام در خطہ کشمیر زبان و ادبیات فارسی و فرہنگ و علوم و فنون ایرانی نیز در سرا سر کشمیر رواج بسیار یافت۔

میر سید علی ہمدانی بہ عنوان مبلغ ایرانی در گوشہ و کنار کشمیر دین اسلام و زبان و فرہنگ و ادبیات ایرانی را انتشار داد و سلاطین شہمیریان احترام ایشان بسیار دارند و با کوششہای سید علی

ہمدانی برای انتشار دادن تعلیمات اسلامی به زبان فارسی و عربی در خطہ کشمیر کمر بسته بودند۔ در این مدت دو و نیم سال بیشتر مردمان کشمیر از زبان فارسی بطور کلی آشنا گردید و ایشان هم با زبان و ادبیات فارسی علاقه بسیار داشتند۔ سلطان علاء الدین برای درس و تدریس تعلیمات قرآنی و شرعی در محلہ علاء الدین پورہ خانقاہی نیز بنا کرد کہ در آن خانقاہ سید علی ہمدانی و رفقای ایشان معمور بہ درس و تدریس بودند۔ ۲

شاہ ہمدان خود مردی بسیار عالم و فاضل و شاعر و نثر نگار چیرہ دست و صاحب تصانیف عربی و فارسی بسیاری بودہ است۔ بعضی از مورخین تعداد تصنیفات ایشان را از صد تا کتاب بیشتر می نویسند کہ در آن ذخیرۃ الملوك، مرآۃ الطالبین، مناجات نامہ، رسالہ مکتوبات، منہاج العارفین، کشف الحقایق، فتوتیہ نفسیہ، حل مشکلات در فارسی و رسالہ اوراد فتحیہ، قدوسیہ، رسالہ احادیث معرفت زہد، چہل حدیث در عربی و مجموعہ غزلیات عرفانی بہ نام ”چہل اسرار“ بسیار مشہور است، تصانیف میر سید علی ہمدانی مبنی بر موضوع ہای دینی و اخلاقی و سیاسی است و در آن عہد کہ زبان فارسی بطور کلی در خطہ کشمیر رائج تمام نبود با اینحال او انتخاب زبان فارسی را در تصانیف خودش خیلی جاذب و آسان کرد کہ نمونہ ہا بیشتر در ”ذخیرۃ الملوك“ و ”مکتوبات“ کہ برای سلطان قطب الدین شہمیر بہ زبان فارسی می نوشتند، و در بیشتر رسالہ ہای ایشان دیدہ می توان شود، تصانیف سید علی ہمدانی معروف ترین تصانیف اولین عہد زبان و ادبیات فارسی در کشمیر بشمار می آمدند۔ ۳

میر سید علی ہمدانی در ختلان کتابخانہ ای قائم کردہ بود و چون سید وارد کشمیر شدند، از آن کتابخانہ بیشتر کتابہای فارسی و عربی با خود آورد۔ میر سید علی ہمدانی بہ اسم ’سید محمد قاضی‘ کہ نگران کتابخانہ ختلان بود در کشمیر ہم معمور بر عہدہ نگران کتابہای سید علی ہمدانی شد و بعد از وفاتش این خدمت بہ ملا احمد را تفویض شد۔ ۴

بعد از وفات سید علی ہمدانی ۷۸۶ ہجری پسرشان ”میر سید محمد ہمدانی“ در سال ۷۹۵ ہجری با گروہی از عرفا و علمای سادات در دورہ سلطان سکندر وارد کشمیر شدند و کتابی بنام ”رسالہ سکندری“ در بارہ تصوّف برای سلطان سکندر بہ زبان فارسی تصنیف کرد، میر سید محمد ہمدانی فعّالیّتہای پدر خود را ادامہ داد و مدت دوازده سال در خطہ کشمیر بسر برد، در طول این مدت نفوذ زبان و ادبیات فارسی بہ اندازہ

ای وسیع گردید کہ سلاطین شہمیریان در سراسر کشمیر بہ زبان فارسی تکلم می کردند و فارسی سرایان و نویسندگان بہ وجود می آمدند و زبان فارسی ساختن خانقاہ قدم می داشتند و وزیر سلطان سکندر بہ دست ایشان مشرف بہ اسلام گردید و سپس عدہ ای بسیار از مردم این سرزمین قبول اسلام نمودند۔ ۵

مولانا سعید الدینؒ ہمراہ میر محمد ہمدانیؒ ہم در سال ۷۹۵ ہجری وارد کشمیر بود، این مردی نیز عالم و فاضل بود و در علم تفسیر و حدیث و منطق و فلسفہ مہارت بسیار داشت، میر محمد ہمدانیؒ ایشان را متولی خانقاہ معلیؒ ”معروف بہ خانقاہ شاہ ہمدانیؒ“ مقرر کرد و در وقف نامہ ایشان را از واژہ های ممتاز و معزز، برادر ارشد و امجد خطاب فرمودند۔ ایشان در محلہ خانقاہ معلیؒ مسکن اختیار نمود و مشغول درس و تدریس بودند۔ از اولادشان علما و فضلا و حکما و شعرا و خطاط متولد شدند۔ این مبلغان ایرانی از زمان شہاب الدین در کشمیر مہاجرت نمودہ بودند و در نتیجہ معاشرت و مصاحبت و روابط مستقیم فرهنگ و زبان فارسی قرار گرفت و از تشویق و حمایت سلاطین شہمیریان و گروہ علما و مبلغان و تاجران کہ سوی کشمیر رہسپار شدند، وجود آنها بر زندگی اجتماعی و فرهنگی مردم تأثیر عمیقی گذاشت۔ در دنبال این روابط فرهنگی و تبلیغ مذہبی زبان فارسی در کشمیر بہ اینطور رواج گرفت کہ در دورہ سلطان شہاب الدین زبان فارسی بہ جای سانسکریت را گرفت و فارسی نہ تنها در امور دولتی بلکہ در محافل ادبی و فرهنگی و سیاسی نیز جای خود را پیدا کرد و در مدارس و شہرہا و قصبہ ها و دہکدہ ها و روستاها جاری شد۔ ۶

از بین ہجده سلاطین شہمیریان کشمیر علاوہ بر زین العابدین، سلطان شہاب الدین، قطب الدین و سلطان سکندر نیز دانش پرور و معشوق فضلا، ادبا و دانشمندان بودند۔ سلطان شہاب الدین مدرسہ ای برای تعلیم اسلامی بہ اسم ”مدرسة القرآن“ تاسیس نہاد و سلطان قطب الدین در شہر سرینگر دانشکدہ ای تاسیس نمود کہ ریاست آن را حاجی محمد قاری بہ عہدہ داشت۔ این دانشکدہ تا اوسط قرن سیزدہم ہجری وجود داشت۔ در زمان سلطان سکندر عدہ ای زیادی از علما و فضلاء اسلام از عراق و خراسان و ماوراء النہر بہ کشمیر مہاجرت نمودند۔

دورہ عظمت شہمیریان اصلاً دورہ سلطان زین العابدین است۔ این عہد دارای علما و نویسندگان و شاعران و تاریخ نویسان و مترجمان بودہ کہ واقعاً استاد زبان فارسی بودند و بر اثر تشویق و حمایت سلطان علم و فرهنگ پرور علمای برہمن نیز زبان فارسی را فرا گرفتند۔ زین العابدین اولین پادشاہ کشمیر گذشت

کہ منصب ملک الشعرائی را در دربار خود دایر نمود و ملا احمد کشمیری اولین کسی است کہ بہ این منصب سرافراز گردید۔ این نکته دارای اهمیت فراوان است کہ در عہد شہمیریان بود کہ زبان فارسی بہ عنوان زبان رسمی شناختہ شد و این زبان بہ جای زبان سانسکریت زبان درباری شد۔ زین العابدین در زمان امیر تیمور ہفت سال در سمرقند پیش امیر تیمور بسر برد و در این زمان با علوم و زبان و ادبیات فارسی و صنایع ظریفہ ایران بطور کلی آشنا گردید۔ ۷

پروفیسور شمس الدین احمد در مقالہ خودشان می نویسند کہ یکبار شاہ رخ میرزا کہ پسر امیر تیمور بود، برای پادشاہ معاصر کشمیر سلطان زین العابدین لعل و جواہر و فیل و اسبہا را بہ عنوان ہدیہ فرستاد، سلطان زین العابدین بعد از تقدیم و تشکر نوشت:

”اگر بہ جای لعل و جواہر عذہ ای از دانشمندان و فضلاء

ایران می فرستادید موجب خوشحالی بیشتر می گردید“

شاہ رخ میرزا برای خوشنودی پادشاہ کشمیر شش نفر از زبدگان علما و دانشمندان دربار بشمول کتابہا در علوم متفرقہ بہ زبان فارسی و عربی از کتابخانہ شخصی فرستاد۔ ۸

زین العابدین دارلترجمہ را تأسیس نہاد کہ آن شعبہ ہای فارسی و سانسکریت را دایر کرد، و در شعبہ سانسکریت تحت نظر ”پاندیت بووہی بہت“ کتابہای کلاسیک فارسی در سانسکریت ترجمہ شد و همچنین در شعبہ فارسی کہ رئیس آن ملا احمد کشمیری بود، کتابہای سانسکریت را بہ فارسی گردانید مثلاً ”مہابھارت“ ہمین طور ”راج ترنگنی“ را کہ راجع بہ کشمیریکی از قدیم ترین تاریخ ہا است بہ زبان فارسی ترجمہ کرد۔ عبدلقادر سروری می نویسند کہ ملا احمد ترجمہ مجمع الحکایات ”کتھا سرت ساگر“ را ترجمہ کرد و اسم آن ”بحر الاسمار“ داشت۔ این نکته باید متذکر شد در کشمیر در این عہد زبان فارسی و تاریخ نویسی بہ بام عروج رسید۔ ۹

خلیق انجم ہم مؤید ہمین عقیدہ بہ نظر می رسد:

”کہتے ہیں کشمیر میں سلطان زین العابدین ۸۷۸-۸۷۷ ہجری کے زمانے میں فارسی زبان کو عروج

حاصل ہوا۔ سلطان نے فارسی کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات مستحکم کرنے کا ذریعہ بنایا“ ۱۰

جانشینان سلطان زین العابدین فعالیتہای ادبی و فرہنگی را ادامہ دادند و این خانوادہ در مدّت

دویست و پنج سال خطہ کشمیر را از لحاظ زبان و فرهنگ و ادبیات به طور کلی به 'ایران صغیر' مبدل کردند و عہد سلاطین شہمیریان در کشمیر نخستین دورہ ترویج و پیشرفت زبان و ادبیات فارسی به شمار می آید۔ نباید فراموش کرد کہ تا سقوط سلسلہ شہمیریان در سال ۹۴۸ هجری این خانواده به بالا بردن پایہ زبان و ادبیات فارسی در کشمیر کوشان بودند۔

حواشی:

۱. تاریخ کشمیر، از حیدر ملک -
۲. خلاصۃ المناقب از نور الدین جعفر بدخشی، شماره ۶۵۸، نسخہ خطی، مرکز تحقیقات جموں و کشمیر - : کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ از عبدلقدار سروری، نگارستان کشمیر، کشمیر، از غلام محی الدین صوفی - کشمیر سلاطین کے عہد میں، از سیّد صباح الدین -
۳. کشمیر، از غلام محی الدین صوفی، جلد اول، ص ۹۰ - : و کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، از عبدلقدار سروری -
۴. زبان فارسی در عہد شہمیریان، چکان و مغولان، از مسرت پروین، قند پارسی، شماره ۲۸ - ۲۷، : و سیّد میر علی ہمدانی، از دکترا سیدہ اشرف ظفر -
۵. تاریخ حسن، از پیر غلام حسن، جلد ۲، ص ۱۷۸ - و تاریخ کشمیر، از حیدر ملک -
۶. تاریخ حسن، از پیر غلام حسن، جلد ۲، ص ۱۸۰ - ۱۷۸ - و شاہ ہمدان، حیات و کارنامے، از شمس الدین احمد، ص - -
۷. جایگاہ سید علی ہمدانی در کشمیر، از نسرت توکلی، قند پارسی، شماره ۱۲۸ - ۱۲۷ -
۸. سیری در ادبیات فارسی از دکترا شمس الدین احمد، دانش، شماره ۵، ص ۱۱ -
۹. واقعات کشمیر، از محمد اعظم دیدہ مری - و تاریخ کشمیر، از حیدر ملک -
۱۰. ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، از سیّد عبداللہ، انجمن ترقی اردو، دہلی نو، ص ۲۲ -

☆☆☆

غنی، و رزندہ فقر

شیر احمد بٹ و لطیف احمد سلمانی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

جمع کردم خار و خاشاکی که سوزم خویش را
گل گمان دارد که بندم آشیان در گلستان

اگرچه معروف ترین شعراء فارسی مثل سعدی، امیر خسرو و حسن باوج کمال رسیدند البتہ می توان گفت کہ آنها نخستین جهانگرد بودند۔ ایشان زشت و زیبا، جبر و زجر و گیرد دار جهان را اول بہ نظر عمیقانہ و دقیقانہ دیدند۔ پس بوی عمیق بینی و جهان شناسی از اشعار آنها می آید و دیگر بر دلہای شنوندگان و خوانندگان تاثیر و سایہ و چاپ می گذارند۔ وقتی کہ ما شاعر نامدار ملا طاهر غنی کشمیری را می بینیم بر عکس ایشان مثل حافظ شیرازی است کہ بہ جهانگردی نرفته است۔ در کنج انزو از ندگئی فقر و فاقہ درون خانہ نی فرش (بی بوری) می کرد۔ در مورد این طرز زندگی در اشعار پر درد و پر مغز سرودہ است۔ ملاحظہ کنید ے

~ گہ نشد طیب ز درد نہان ما

این نبط ما خوش تر است از زبان ما

اگرچه غنی کشمیری جهانگرد نبود ولی مثل رودکی شمع درونی را روشن کردہ بود و مثل شمع، خودش را می سوخت و از اشعار خود رونق بزمہای دلش را می افزود۔ بقول علامہ اقبال ے
نہ تو اندر حرم گنجی نہ در بتخانہ می آئی
ولیکن سوی مشتاقان چہ مشتاقانہ می آئی

اگرچه در مورد حیات غنی کشمیری کہ اسمش ملا محمد طاهر است و غنی تخلص داشت اطلاع بیشتر بدست نیامدہ است البتہ از تذکرہ نویسندگان این حقیقت جدی وامی شود کہ غنی کشمیری ارتثاً از خانہ عشائی شوق علم و فضل و ذوق زہد و تقوی یافتہ بود۔ از مدرسہ قطبیہ کہ در محلہ قطب الدین پورہ در شہر سرینگر سلطان قطب الدین تاسیس کردہ بود، علوم متداول فرا گرفت۔ این مدرسہ ای بود کہ در آن ہنگام مرکز علوم انسانی بود و علماء برجستہ و عارفان کامل آنزمان در انجا مشغول درس و تدریس بودند مثل ملا جوہر نات، ملا عبد الستار و ملا محسن فانی و جز آن۔ غنی کشمیری ازین مدرسہ تمام علوم متداولہ از جملہ ادبیات فارسی و عربی و فلسفہ و حکمت و

دیگر علم طب ہم فرا گرفت۔ محسن فانی کشمیری در آن هنگام یکی از علماء برجستہ ای بود کہ نہ فقط ماهر ادبیات بود بلکه در دینیات و ادبیات و اسلامیات و تاریخ، مذاہب جہان چیرہ دست بود۔ وی بتوسط علوم اسلامی خود سہ نفر ہنود را مشرف بہ اسلام و دین مبین حق کرد۔ محمد اسلم سالم یکی از همان مسلم شدہ ہا است کہ دیگر از حیث شاعر برجستہ و معروف گردید۔ ملا طاہر غنی کشمیری ازین قدر استادان عالی ہمت و قدر تربیت یافت و از ظاہر و باطن بہ مرتبہ بالا رسید۔ بقول محمد علی ماهر ے

چون دادش فیض صحبت شیخ کامل محسن فانی
غنی سر حلقہٴ اصحاب او در نکتہ دانی شد

نویسندهٴ برجستہ و مثنوی و غزل سراء اعلیٰ چون محسن فانی استاد و رہبر غنی کشمیری بود این لازم است کہ دیگر غنی کشمیری از حیث عارف و شاعر نامدار معروف گردد۔ غنی مردی قانع و فقیر منش و دیندار و گوشہ نشین و عزلت نفس بود۔ موضوعات فراوان از اشعار غنی بدست می آیند مثل حسن و عشق، ناپائنداری، مرگ، کوشی، داخلیت پسندی و غم پسندی و جز آن۔ غنی کشمیری در حیات خود مدح گوئی را وسیلہٴ کسب معاش نساختہ بلکه این را موجب ننگ می پنداشت۔ ملاحظہ کنید ے

بچشم آب و رنگینی نیست خوان پادشاہان را
کہ دارد کاسہٴ درویش نعمتہای الوان را
غنی چرا صلۃ از کسی گیرد
ہمین بس است کہ شعرش گرفت عالم را
غنی اگر چہ فقیر است ہمتی دارد
فشاندہ است بکونین دست خالی را

از تذکرہ نویسندگان این حقیقت ہم و ا می شود کہ صائب تبریزی یکی از بزرگترین شاعر معاصر غنی از اشعار غنی متاثر شدہ بود۔ چون روزی در دہلی آمدہ بود عزیمت کشمیر کرد و با غنی ملاقی گشت۔ باہم در ذل سفر می کردند و از طبیعت غنی و اشعارش خیلی متاثر شدہ بود۔ چون صائب بہ ایران برگشت، اشعار غنی را یاد می کرد۔ ہر گاہ کسی از ایران سائر کشمیر می گشت و صائب اطلاعش می گرفت۔ پس از برگشتن بہ ایران صائب از وی پرسید کہ کدام ارمغان برای من آورده ای۔ در نظر صائب مراد ارمغان کلام غنی می بود۔ چون در مورد حیات غنی و اشعار وی می خوانیم این

راز و امی شود که غنی مردی فقیر بود. بوی فقیرانه از اشعار غنی بر می آید و معلوم می شود که فقری را در حیات خود ورزیده بودند. از زبان علامه اقبال ۷

شاعر رنگین نوا طاهر غنی

فقر او ظاهر غنی باطن غنی

قبل از اینکه ما فقر غنی را توضیح بدهیم باید فقر را که طریقهٔ پیامبرانه است یک خورده توضیح بدهیم. حضرت سرور کائنات فخر موجودات ﷺ فرمودند که الفقر فخری یعنی ما را بر فقر فخر است. حضرت مایم بن محمدؓ گوید که اوصاف فقر اینند که بنده محافظ اسرار درونی باشد و به نفس خویش را حفاظت کند. حضرت شبلی می گوید که فقیر آنست که جز بیاد خدا در هیچ متاعی راحت نیابد. حضرت ابوالحسن نوریؒ می گوید که اوصاف فقر اینند که چون هیچ متاع ندارد، ساکت می ماند و چون یابد به کار می برد و چون دارد بحالت اضطرابی می ماند.

از این اقوال بزرگان سلف واضع می شود که غنی واقعاً فقیر بود. طریقه فقر نه فقط در حیات خودش ورزیده بود بلکه اشعارهائی که سروده است از آن هم این وا می شود که مشاهده ها و تجربه های فقر به اندازه دلپذیری بیان نموده است. آنها راست های جهان (Universal Truth) را بخوبی و چیره دستی عیان کرده است. پند و نصایح که در حیات مردم کار آمد است را هم از اشعار خویش بما رسانیده است. رفتار خوب که باید با همسائگان و هم جنسان کرد اینطور بیان می کند ۷

سعی بر راحت همسائگان کردن خوش است

دست کس بگیر اگر دستت می دهد

رفیق اهل غفلت کی شد از کار می مانند

چوپای خند پای دیگر از رفتار می مانند

در نظر غنی تنعم خوب، صفائی قلب و نور درونی چیزهائی هستند که از ایشان حقایق و

دقایق حیات و کائنات منکشف می شوند ۷

عشق بر یک فرش بنشانند گدا و شاه را

سیل یکسان میکند پست و بلند راه را

بالآخر غنی زندگی خویش را نثار بر فقر کرد. روزی اورنگ زیب عالمگیر سیف خان را نوشت که غنی شاعر برجسته ای را به دربار دهلی بکشید. چون سیف خان همانطور کرد غنی قانع بود راضی نشد که به دهلی برود. بالآخر دیوانه وار در محبت فقر و در رضای الهی جامه را چاک کرد و

جان بخالق حقیقی سپرد و بنای فقر را قوی و محکم تر ساخت ۷
توتیای چشم مه جز پرتو خورشید نیست
ما بنور دوست می بینم حسن روی دوست

کتابیات

۱. دیوان غنی شایع کردہ جموں و کشمیر اکادمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر۔ سال اشاعت ۱۹۸۲ء
۲. دیوان غنی مرتب از احمد کرمانی
۳. غنی کشمیری (حیات اور شاعری) از نیلوفر ناز نحوی طباعت ۲۰۰۲ء
۴. پارسی سرایان کشمیر از تیگو
۵. تاریخ حسن جلد سوم، چہارم و دوم از حسن کہویہامی
۶. غنی کشمیری احوال و آثار و سبک اشعار او از دکتر ریاض شیروانی
۷. دانش (مجلہ بخش فارسی دانشگاه کشمیر) سال اشاعت ۲۰۰۹ء
۸. کلیات اقبال از علامہ اقبال

☆☆☆

غربت میں جا کے چمکے

عالم اعظمی، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ

تقسیم ملک ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش تینوں ممالک کے لئے ایک حادثہ جا نگاہ ثابت ہوئی۔ ہجرت کے سفر کی تھکن آج تک اعصاب پر سوار ہے۔ اعظم گڑھ کے کیسے کیسے گنجانے گراں مایہ ہجرت کی نذر ہو گئے۔ بہت سے اعظمی گمنامی کی گرد میں کھو گئے لیکن کچھ ایسے خوش نصیب بھی تھے جو آسمان علم و ادب پر ہم دوش ثریا بن کر صوفشاں ہوئے۔ سرزمین اعظم گڑھ نے جن گہر ریزوں اور جواہر پاروں کو کھویا ان میں حسین اعظمی ایک نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے بادلِ ناخواستہ اس ذہنی کرب کے ساتھ پاکستان کو ہجرت کی کہ نگاہ ہندوستان کی طرف تھی اور قدم سفر کی طرف۔ حسین اعظمی ایک شاعرانہ شخصیت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ آپ لیلائے فن کے کاکل پیچاں کے ایسے اسیر ہوئے کہ زلیخائے جاہ و منصب آپ کی ایک عکسِ التفات کو ترس کر رہ گئی۔ یہ بات آپ کی بے نیازی اور قلندر صفاتی پر ہی محمول کی جاسکتی ہے کہ آپ کی گوشہ گیری اور عزلت نشینی کے سبب آپ کی فکر فلک رس اور تخیل عرش نشین تک ناقدین کی نگاہ حیر نہیں پہنچ سکی لیکن اب اسے کیا کہئے کہ آشفۃ حالی اہل کمال کا مقدر ہے۔ ذوقِ دہلوی نے کتنی سچی اور درد انگیز تصویر کھینچی ہے

یوں پھریں اہل کمال آشفۃ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے
ذوق سے پہلے میر نے پریشانی میں اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

جب سے جہاں ہے تب سے خرابی یہی ہے میر
تم دیکھ کر زمانے کو حیران کیا رہے
میر سے بہت پہلے حافظ شیرازی نے کہا تھا:

اسپ تازی شدہ مجروح بزریر پالاں

طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خرمی بینم

اور تقریباً یہی کچھ حسین اعظمی کے ساتھ بھی ہوا۔ تاہم جہاں تک قدر دانی فن کا تعلق ہے حسین اعظمی کے تئیں ناقدین ادب کا رویہ حوصلہ افزا نہیں تو بہت تشویشناک بھی نہیں رہا اور اس کا دل فن پر چند جوہر شناسوں کی نگاہیں پڑ ہی گئیں۔ حسین اعظمی پر جن ارباب نقد و نظر نے تنقید و تجزیہ کے جواہر پارے زیب فرطاس کیے ان میں روزنامہ ”جنگ“ اور روزنامہ ”حریت“ کے فاضل تبصرہ نگاروں کے علاوہ معروف نقاد احسن فاروقی اور شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان تجزیہ نگاروں کی پرمغز اور گراں قدر آراء حسین اعظمی کے شعری مقام و مرتبہ پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ یہ تبصرے ان کے مرثیوں کے مجموعے ”حرف حق“ پر کیے گئے ہیں۔ اپنے شعری مسلک اور ادبی مکتب فکر کی وضاحت کے طور پر حسین اعظمی نے مجموعہ کلام کے سرورق پر چار مصرعے درج کیے ہیں جو نہ صرف یہ کہ پوری کتاب کو پڑھنے کی دعوت ہیں بلکہ دورانِ مطالعہ اکثر و بیشتر مواقع پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا پورا کلام ان چار مصرعوں کی تفسیر ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ سرورق پر درج چار مصرعے دعویٰ کی حیثیت رکھتے ہیں اور پوری کتاب اس دعوے کی

دلیل سے عبارت ہے۔ وہ مصرعے ہدیہ ناظرین ہیں:

ہزار	دولت	دنیا	بھی	ہو	تو	کم	مجھ	کو
ملا	ہے	صورت	دل	ایک	جام	جم	مجھ	کو
کسی	کو	منصب	و	کرسی	کسی	کو	طل	علم
خوشا	نصیب	کہ	بخشا	گیا	قلم	مجھ	کو	

حسین اعظمی کے مجموعہ کلام 'حرف حق' پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ جنگ لکھتا ہے:

”حرف حق“ ایک جدید مرثیہ ہے جس کا چہرہ دعائیہ ہونے کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے بے عمل اور گم گشتہ منزل معاشرے پر بھرپور طنز ہے۔ آج بھی انسان حق کا متلاشی ہے اور باطل آج بھی انسانیت اور صداقت کی بیخ کنی پر کمر بستہ۔ ان بڑھتے ہوئے طوفانوں اور پھلتے ہوئے اندھیروں میں آج بھی روشنی کا حصول کیونکر ممکن ہے، یہ وقت کا اہم سوال ہے۔ جناب حسین اعظمی نے وقت کے ان اہم تقاضوں پر اپنے جذبات و محسوسات کو اس طرح منظوم کیا ہے کہ ان کے یہ اشعار بیسویں صدی عیسوی کے اس عہد سمارجیت کے لئے ایک انقلابی پیغام بن گئے ہیں۔“

(حرف حق، حسین اعظمی ص: 6)

روزنامہ ڈان لکھتا ہے:

”.....لطیف اور دل پذیر انداز بیان کے ذریعہ قاری کی توجہ اس جانب مبذول کرائی گئی ہے کہ موجودہ دور کی برائیاں بلا روک ٹوک اس لئے پھل پھول رہی ہیں کہ ہم اس ابدی صداقت کا ادراک کرنے سے قاصر رہے جسے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے نے اپنی عظیم قربانی کے ذریعہ ہم تک پہنچایا ہے.....“

(حرف حق، ص: 7)

روزنامہ حریت لکھتا ہے:

”.....حسین اعظمی کا یہ مرثیہ 'حرف حق' اس اعتبار سے توجہ کا مستحق ہے کہ انہوں نے اس مرثیے کے ذریعہ موجودہ دور کی استحصال پسند ذہنیت کی نقاب کشائی کی اور بتایا کہ امام حسین نے باطل قوتوں کے خلاف جہاد کیا تھا اور حق کی حفاظت کے لئے اپنی جان بھی نچھاور کرنے سے دریغ نہیں کیا تھا آج بھی اسوہ حسین پر عمل کرتے ہوئے تمام باطل پسند قوتوں اور استحصال پسند طاقتوں کی سرکوبی کی جاسکتی ہے۔ یہی اس مرثیے کے مصنف کا اپنے پڑھنے والوں کے نام پیغام ہے.....“

(حرف حق، ص: 8)

ڈاکٹر احسن فاروقی معروف نقاد ہیں۔ ان کے تنقیدی معیار پر کم ہی خوش نصیب ہیں جو پورے اترتے ہیں۔ یہ عیب جوئی اور موشگافی کے لئے مشہور ہیں لیکن حسین اعظمی کی لیلائے فن نے انہیں بھی رام کر رکھا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

”اس وقت ہمارے ملک میں ان ریاکاروں کا شور و غوغا بلند ہے جو اسلام کے نام پر کفر برت رہے ہیں۔ ایسے لوگ شروع ہی سے موجود تھے اور جنہوں نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ وہ اسلام کی بیخ کنی کرنے اور دین کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ آج بھی اس مکتب فکر کے لوگ

اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ایسے علمائے سو کے بارے میں اعظمی صاحب کہتے ہیں:

وہی اسلام سے نفرت ہے وہی بیزاری
دیں میں تحریف کی کوشش ہے ابھی تک جاری
سر ہے سجدوں میں مگر دل میں بتوں سے یاری
بت پرستوں نے نہیں آج بھی ہمت ہاری
آستیوں میں نہیں دل میں لئے بیٹھے ہیں
کتنے بہت خانے یہ محل میں لئے بیٹھے ہیں

احسن فاروقی نے جناب اعظمی کو مرثیوں کے وسیلے سے گندم نما جو فروشن اور مسلم ناشیطانوں کی پول کھولنے والا بتایا ہے۔

شاعر انقلاب جوش ملیح آباد بھی جناب اعظمی کی بارگاہ میں آکر مطیع ہو جاتے ہیں۔ ان کو بھی حسین اعظمی کی شاعری میں وہی جوش و خروش اور گھن گرج نظر آتی ہے جو خود ان کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔

جناب جوش ملیح آباد فرماتے ہیں:

”حسین اعظمی صاحب کا مرثیہ ’حرف حق‘ جا بجا دیکھا اور اس خیال سے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ محبان حسین کو ان کی تقلید کی جانب پکار رہے ہیں..... حسینؒ کی شہادت پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے لیکن سو گوارا ان حسین کو یہ معلوم نہیں کہ حسین نے اپنی اور گھر بھر کی جانیں صرف اس لئے نہیں گنوائی تھیں کہ فقط ان کے ماتم پر قناعت فرمائی جائے اور کسی کو ان کی تقلید کا خیال بھی نہ آئے۔ حسین اعظمی صاحب کی بصارت نے یہ نکتہ پالیا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ رونے والوں کے ہاتھ میں باطل شکن تلوار دے دیں اور ظاہر ہے کہ یہ ایک عظیم اور بے کراں فریضہ ہے جس کو وہ ادا کر رہے ہیں۔“

(حرف حق، ص: 65)

حسین اعظمی نے ایسے دور میں مرثیہ نگاری میں اپنی انفرادیت اور شناخت قائم کی جب اس صنف کا آفتاب عالم تاب لب بام آ گیا ہے۔ مرثیہ ایک شاندار ماضی کی مالک صنف سخن ہے۔ اردو کے دامن کو متمول عطا کرنے اور اس کو ذخیرۃ الفاظ کی قابل رشک دولت عطا کرنے میں جو کردار اس صنف نے ادا کیا ہے وہ کسی اور صنف سخن کے حصہ میں نہیں آیا لیکن فی زمانہ مرثیہ نگاری کمیت کے لحاظ سے تو تسلی بخش ہے تاہم کیفیت کے اعتبار سے تشویشناک صورت حال سے دوچار ہے جبکہ غم شہادت آج بھی سینوں میں تازہ ہے اور ہر سال نہایت پابندی اور اہتمام کے ساتھ اس کی تجدید بھی کی جاتی ہے۔ مرثیے آج بھی لکھے جا رہے ہیں لیکن فن رو بہ زوال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو ہو جاتا ہے۔ جب یہ صورت حال درپیش ہو تو فن قربان ہو جاتا ہے اور مقصدیت ایک نعرہ یا پروپیگنڈہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ ادب برائے ادب کا نظریہ خواہ کتنا ہی رومانی اور غیر حقیقی قرار دیا جائے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ کوئی بھی ادب پہلے ادب ہے اور بعد کو کچھ اور۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ عمیق و پیچیدہ فکر اگر وجدان اور فن کے سائے میں فروغ پاتی ہے تو عظیم ادب وجود میں آتا ہے ورنہ عقیدت سے پُر اور فن سے عاری مرثیہ صرف رورو کر و مال بھگونے اور ’نامہ اعمال دھونے‘ سے عبارت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس صورت حال نے ایسے طلباء کی بڑی تعداد کو مرثیے سے دور کر دیا جو مذہبی یا مسلکی اعتبار سے مظلومین کر بلا سے غیر متعلق تھے اور جنہیں غم حسین سے زیادہ فن شعر عزیز تھا لیکن حسین اعظمی کے مرثیے استثنائی حیثیت کے حامل ہیں۔ انہیں واقعات کر بلا کی علامت کے پردے میں عصری مسائل کو خوش سلیقگی کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر آتا ہے۔ ان کے مرثیے

کی مقناطیسیت قاری کو اول تا آخر اپنی گرفت میں لئے رہتی ہے اور وہ بہ یک نشست کشش فن کے سبب پورے مجموعے کے مطالعے پر مجبور ہوتا ہے۔ فن کی گرفت کے علاوہ قاری کو حسین اعظمی کے مراثی اس لئے بھی عزیز ہیں کہ وہ ان کے آئینے میں اپنے گرد و پیش کے مسائل کا عکس دیکھتا ہے۔ مضمون کے آخر میں ناقدین و مبصرین کے دعوؤں کی دلیل کے طور پر حسین اعظمی کے ایک مرثیے کے مزید دو بند ہدیہ ناظرین ہیں:

دیں	کو	باز میچہ	اطفال	بنانے	والو!
کفر	سازی	کی	دکانوں	سجانے	والو!
انبیاء	کو	بھی	خطا کار	بتانے	والو!
مجمع	عام	میں	قرآن	جلانے	والو!

دل میں جو کچھ ہے تمہارے وہ کہو اور سنو!

بات جب کفر کی چھیڑی ہے تو لو اور سنو!

گر	تمکن	ہو	تو	پھر	ظلم	کا	سہنا	بھی	ہے	کفر
ظلم	کے	دھارے	پہ	مایوسی	سے	بہنا	بھی	ہے	کفر	
ظلم	کے	دور	میں	چپ	سادھ	کے	رہنا	بھی	ہے	کفر
ظلم	کو	کھل	کے	کبھی	ظلم	نہ	کہنا	بھی	ہے	کفر

ظلم تھک جاتا ہے مظلوم نہیں ہارتے ہیں

مرد ظالم کو سر دار بھی لٹکارتے ہیں



”ہدایت المخلصین“ کا اجمالی تعارف

لطیف احمد سلمانی، ریسرچ اسکالرشعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔

کشمیر کا خطہ جنت عہد وسطیٰ میں جن روحانی شخصیتوں کی دینی تبلیغ کی بدولت قلعہ اسلام اور ایران صغیر بن گیا تھا ان میں عالی مرتبت سادات کی اولیت مسلم ہے۔ جو خالصتاً اسلام کی ترویج و اشاعت کا کام آگے بڑھانے کی غرض سے حضرت سید عبدالرحمن بلبل شاہ ترکستانی اور حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی کی سربراہی میں وارد کشمیر ہوئے تھے اور جو عموماً وسط ایشیا یا ایران کے مختلف علاقوں سے چل کر یہاں آئے تھے۔ لیکن چودھویں صدی عیسوی کے دوران اہل علم و ہنر پر مشتمل دو بڑے کاروان ساتھ لے کر یہاں آنے والے ان پیشروؤں کے کارہائے نمایاں کا ذکر سن کر بعد کی تین صدیوں میں بھی یہاں باہر سے آنے والے ارباب علم و فضل کی نہ صرف یہ کہ خوب پذیرائی ہوتی رہی ہے بلکہ حضرت نور الدین کشمیریؒ اور حضرت شیخ حمزہ مخدوم کشمیریؒ سے براہ راست فیضان پانے کی غرض سے پیر پنچال کے اس پار سکونت پذیر لوگ اب دوسرے قسم کے مقاصد لیکر یہاں پہنچنے لگتے ہیں۔ مثلاً شیخ اول کی خدمت میں کشتواڑ کے راجپوت خاندان کا زیا سنگ آکر مشرف بہ اسلام ہوتا ہے اور زین الدین ولی بن کر عیش مقام کے گرد و نواح کو ایمان و عرفان کا فیضان پہنچاتا ہے تاکہ جنوبی کشمیر کے دور افتادہ دیہات میں تازہ وارد اسلام کی ضیاء باریوں سے فیضیاب ہو سکیں۔ اسی طرح کئی صدیوں بعد گجرات کے سادات علوی کے چشم و چراغ میر سید بابا حیدر تیلہ مولیٰ اپنے آپ کو معاصر کشمیر کے آفتاب روحانیت حضرت شیخ حمزہ کشمیریؒ کی خدمت میں پہنچا کر اپنے ایمان و عرفان کو تقویت بہم پہنچاتے ہیں۔ اور شمالی کشمیر کے دور افتادہ دیہات کو فیضان اسلامی پہنچانے کے لئے اپنے مرشد کی ہدایت پر لار پرگنہ تیلہ مولہ گاؤں میں بود و باش اختیار کرتے ہیں۔

گجرات کے علوی سادات کے گھر میں ۸۹۱ھ کے دوران ایک ایسا حسین اور سعادت مند بچہ متولد ہوا جس کے روشن آثار دیکھ کر اپنی خاندان کی روایت کو ملحوظ نظر رکھ کر اس کے مستقبل کے ساتھ اچھا توقع رکھ کر اس کا نام حیدر رکھا گیا۔

سید بابا حیدر تیلہ مولیٰ نے ایک سو دس سال کی عمر پائی تھی (۱) اور اس عمر دراز کا بیشتر حصہ انہوں نے انتہائی فقر و استغنائی گزارا تھا۔ یہ طرز زندگی بابا حیدر نے اپنی رضامندی سے اختیار کیا تھا۔ فقر و فاقہ میں شکوہ و شکایت نہ کرنے کی روشن اختیار کرنے والے اس روحانی بزرگ نے ۹۹۹ھ کے ماہ محرم الحرام میں وفات پائی (۲)۔ اور پرگنہ لار کے موضع تیلہ مولہ میں سپرد خاک کئے گئے۔

بابا حیدر تیلہ مولیٰ کی دستیاب شدہ کتاب ”ہدایت المخلصین“ تصوف و عرفان کے علاوہ حضرت مخدوم کے کشف و کرامات اور ان کے مریدوں سے متعلق کشمیر میں اکبری دور میں فارسی نثر کی ایک عمدہ تصنیف ہے۔ حضرت مخدوم بابا حیدر کے مرشد کامل اور راہ سلوک میں ان کے پیشوا اور پیر طریقت تھے۔ اگرچہ یہ کتاب راہ سلوک پر گامزن ہونے والے سالک کی راہنمائی کے لئے تحریر کی گئی ہے لیکن کتاب کا بیشتر حصہ حضرت مخدوم کے مقامات اور کرامات پر وقف کیا گیا ہے۔ مصنف نے مذکورہ کتاب کو مندرجہ ذیل پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

باب اول: مبتدی کے اعمال کے بارے میں

باب دوم: مبتدی کے اشغال کے بارے میں

باب سیوم: مبتدی کے اذکار کے بارے میں

باب چہارم: نکات تصوف کے بارے میں

باب پنجم: حضرت محبوب العالم اور ان کے مخلصین و مریدین کے حالات کے بارے میں (۳)۔

پہلے باب میں بابا حیدر تیلہ موٹی نے راہ سلوک میں نو آموز سالک کے اعمال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ جب سالک اپنے مرشد کی خدمت میں آجائے تو مرشد کے لئے لازمی ہے کہ وہ سالک کو نماز پنجگانہ باجماعت ادا کرنے کی تلقین کرے اور جب مبتدی کو اس کی عادت ہو جائے تو اسے ہمیشہ عبادت میں مشغول رہنے کی تعلیم دے بلکہ

نماز فجر سے طلوع آفتاب تک مبتدی کو دنیاوی معاملات میں مشغول نہ رہنے کا درس دے اور یہ وقت وظائف و اوراد میں گزارنے کا اسے درس دے۔ مبتدی نماز اشراق سے چاشت تک ہر روز قرآن مجید کی تلاوت کرتا رہے۔ زوال کے وقت اپنے مرشد کی صحبت میں جائے۔ نماز ظہر سے عصر تک کسب معاش میں مشغول رہے لیکن یہ کسب معاش مذہبی قوانین کے تحت حلال ہو۔ نماز عصر سے مغرب کی نماز تک کسی کے ساتھ دنیاوی معاملات میں مشغول نہ ہو بلکہ اپنے مرشد کے دئے ہوئے وظائف میں مصروف رہے۔ مغرب سے عشاء تک وظائف اور نوافل ادا کرتا رہے۔ اور نماز عشاء کے بعد

اپنے پیران کا شجرہ پڑھے (۴)۔

ہدایت المخلصین کا دوسرا باب نو آموز سالک کے اشغال سے متعلق ہے۔ اس باب میں شیخ حیدر سالک کو اپنے مرشد کے بتائے ہوئے شغل پر گامزن ہونے کی نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سالک کورات کا کچھ حصہ شرعی مسائل اور احادیث کے مطالعے میں گزارنا چاہئے کچھ حصہ آرام میں اور اگر ہو سکے تو بیدار رہ کر چشم دل تجلی ذات حق کے لئے کھلی رکھے (۵)۔

بابا حیدر کے بقول مبتدی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صائم الدھر، قائم اللیل، اور تارک اللحم ہو۔ کیونکہ جب سالک ان چیزوں کا پابند ہو اور وظائف و اوراد، افکار و اذکار میں ہمیشہ محو ہو تو یقیناً وہ عالم ارواح اور عالم ملکوت کے راز منکشف کر سکتا ہے۔ سالک اپنے نفس امارہ کو پہچان کر ہی انسان یا آدمی ہے اور متذکرہ بالا اشغال کے انجام دینے سے انسان کی خودی محو ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ پھر بھی انسان مطلق نہیں کہلایا جاسکتا۔ انسان کا وجود دراصل اس کی حقیقت ہے جو انسان کا وفات تک ساتھ نہیں چھوڑتا بلکہ جسم دراصل روح کے تابع ہے اور جس نے اتباع کیا اس نے حقیقت پائی (۶)۔

سالک کو بابا حیدر کے بقول غافل لوگوں اور عورتوں کی صحبت سے گریز کرنا چاہئے۔ فتنا انگیز اور آشوب آمیز لوگوں کے ملنے سے پرہیز اور اہل منصب سلاطین اور امراء جیسے دولت مند لوگوں کی صحبت سے اجتناب کرنا چاہئے۔ اس طرح سے شغل ید، شغل زبان، شغل دل، شغل نفس، شغل چشم اور شغل گوش وغیرہ جیسے اشغال بھی اپنی اہمیت رکھتے ہیں (۷)۔

ہدایت المخلصین کا تیسرا باب اذکار کے بارے میں ہے اس باب میں بابا حیدر سالک کو ذکر کے طریقوں سے واقف کراتے ہیں۔ حضرت شیخ حمزہؒ نے جس ذکر کی اجازت خود بابا حیدر کو دی تھی۔ اس ذکر کی تلقین وہ اپنے مریدوں اور مخلصوں سے بھی کرتے ہیں وہ ذکر یہ ہے۔ ”اللہ الحاضی اللہ

المعشوق“ (۸) اس کے علاوہ اس باب میں بابا

حیدر سالک کو مراقبہ کے طریقے سے بھی آشنا کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سالک کو مراقبہ سے قبل غسل یا طہارت کرنا چاہئے اور اپنے دل میں یہ نیت رکھنی

چاہئے کہ فنائے وجود کی خاطر اپنے جسم کو صاف کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ محبوب مطلق اس کے دل میں جلوہ گر ہو سکے (۹)۔ اس کے بعد بابا حیدرؒ سالک کو اس ذکر کی تلقین کرتے ہیں۔ **هو المطلوب هو المقصود (۱۰)۔**

جہاں تک ہدایت المخلصین کے چوتھے باب کا تعلق ہے۔ یہ پچھلے تین ابواب کے مقابلے میں مفصل تر ہے اور اس میں مصنف کے طریقت میں محبت، شوق، صلاح، تقویٰ اور تصوف کے بعض نصیحت آموز و رموز کو آشکارا کیا ہے اور ان اسرار و رموز میں کچھ تو ان کے پیر طریقت کے ارشادات پر مبنی ہیں۔

مصنف نے اس باب میں عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ تصور کرتے ہوئے لکھا ہے کہ درحقیقت محبت ایک ایسی خبر ہے جس سے کوئی شی خالی نہیں خواہ وہ مجازی رنگ میں ہو یا حقیقی صورت میں کیونکہ دنیا میں جو بھی شی قائم ہوگی وہ محبت کے بغیر نہیں ہو سکتی پس ہر ایک خبر جس میں محبت جیسی شے ہوگی وہ شے شے مجازی ہوگی اور اس کی محبت مجازی پر قائم ہوگی (۱۱)۔ لیکن سالکوں کی محبت کا انحصار ان کی نیت پر ہوتا ہے۔ جیسے اس حدیث مبارک میں آیا ہے۔ ”انما الاعمال بالنیات“ لہذا عشق مجازی میں محض نیت پر انحصار ہوتا ہے۔ چنانچہ ”المجاز قنطرہ الحقیقت“ عشق باری میں بے حد ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اسے مجاز سے حقیقت کی طرف رہنمائی کر سکے ورنہ ضلالت کی دلدل میں فنا ہو جانے کا خطرہ ہے (۱۲)۔

سالک کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں معرفت کی حیثیت موجود ہو۔ معرفت دو طرح کا ہے معرفت نفس خود اور معرفت حق تعالیٰ لیکن ان دونوں میں معرفت نفس مقدم ہے کیونکہ جس شخص نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا اس نے خدا کو بھی نہیں پہچانا چنانچہ **من عرف نفسه فقد عرف ربه (۱۳)۔**

ہدایت المخلصین کا پانچواں باب جو آخری باب ہیں۔ اس باب میں بابا حیدرؒ نے اپنے مرشد کامل حضرت مخدومؒ کے حالات اور ان کے کشف و کرامات درج کئے ہیں۔ اس کے علاوہ بابا حیدرؒ نے اس باب میں اپنے پیر طریقت کے اہم خلفاء کے حالات اور راہ سلوک میں ان کے مشاغل اور بعض کی تصنیفات کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس باب میں چونکہ مصنف نے کشمیر میں اپنے معاصر صوفیوں، عارفوں اور مجذوبوں کے احوال نہایت شرح و بسط کے ساتھ قلمبند کئے ہیں۔ اس لحاظ سے مذکورہ کتاب کا یہ باب اکبر کے عہد میں کشمیر کے بعض فارسی عالموں، فاضلوں اور ادیبوں کے احوال اور ان کی تصنیفات سے متعلق پہلے درجے کا مآخذ قرار پاتا ہے۔ اس تصنیف میں جن معاصر علماء، صوفیاء، اور مشائخ کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان میں زین علی (۱۴) بابا دادود خاکی (۱۵)، مولیٰ شیخ احمد چاگلی (۱۶)، خواجہ حسن قاری (۱۷)، خواجہ اسحق قاری (۱۸)، مولانا جوہر نانت (۱۹)، بابا علی رینہ (۲۰)، زین علی ماتچو (۲۱)، خواجہ میرم بزاز (۲۲) قابل ذکر ہے۔

میری رائے میں اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف خاص راہ طریقت شخص کے لئے مفید ہوگا بلکہ ہر عام انسان کے لئے نہایت فائدہ بخش ہوگا۔

حوالہ جات

- ۱۔ ہدایت المخلصین از بابا حیدر برگ ۱۶۶م الف مخطوط کتب خانہ جموں و کشمیر محکمہ تحقیق و اشاعت سری نگر زیر شمارہ ۴۹۷
- ۲۔ ایضاً برگ ۲۳۳م الف ۳۔ ایضاً برگ ۲م الف ۴۔ ایضاً برگ ۳م الف
- ۵۔ ایضاً برگ ۵م الف ۶۔ ایضاً برگ ۵م الف ۷۔ ایضاً برگ ۶م الف
- ۸۔ ایضاً برگ ۷م الف ۹۔ ایضاً برگ ۱۰م الف ۱۰۔ ایضاً برگ ۱۲م الف ۱۱۔ ایضاً برگ ۱۳م الف
- ۱۲۔ ایضاً برگ ۱۴م الف ۱۳۔ ایضاً برگ ۳۲م الف
- ۱۴۔ ایضاً برگ ۱۹۱م الف ۱۵۔ ایضاً برگ ۸۴-۱۹۹م الف ۱۶۔ ایضاً برگ ۱۰۶م الف ۱۷۔ ایضاً برگ ۱۱۲م
- الف ۱۸۔ ایضاً برگ ۱۵۴م الف ۱۹۔ ایضاً برگ ۱۴۵م الف
- ۲۰۔ ایضاً برگ ۱۲۶م الف ۲۱۔ ایضاً برگ ۱۱۸-۱۹۹م الف ۲۲۔ ایضاً برگ ۱۷م الف

☆☆☆

ملا بہاؤ الدین متو

شفیق احمد ولد محمد صابر، شعبہ فارسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

یہ بات تو روز روشن کی طرح عیان ہے کہ سرزمین کشمیر زمانہ قدیم سے ہی شعراء، علماء، عرفاء، فقراء کا گہوارہ ہے اور ایسے نامور اشخاص کو جنم دیا جنہوں نے نہ صرف سرزمین کشمیر کو منور کیا بلکہ پوری دنیا میں مشہور ہو گئے۔ سرزمین کشمیر کو صوفیاء کرام کی زمین کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سرزمین کشمیر ۴۲۱۰۰۰ اولیاء کرام کی ابدی خواب گاہ بنی ہوئی ہے۔ یہ سرزمین ادبی لحاظ سے درخشندہ ستارہ کی مانند آسمان ادب پر چمک رہی ہے۔ ادب پروری میں دورہ چکان، افغان اور مغولان نے کوئی بھی کثر باقی نہیں چھوڑی۔ سیاحی اعتبار سے کشمیر دنیا میں سرفہرست ہے، معرف مغل بادشاہ جہانگیر، کشمیر کی سیاحت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

گر فردوس بروی زمین است

ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

بقول معروف فارسی شاعر عرفی شیرازی:

ہر سوختہ جانی کہ بہ کشمیر در آید

اگر مرغ کباب است ببال و پر آید

سکھ دور میں بھی فارسی زبان و ادب کی ترویج و ترقی کی طرف توجہ دی گئی، جب ملا بہاؤ الدین متو نے دنیا میں آنکھ کھولی اس وقت کشمیر میں افغانوں کا دور دورہ تھا جو فارسی شعروادب کے ساتھ بہت شغف رکھتے تھے۔ اور جب ملا بہاؤ الدین متو نے فارسی زبان و ادب کی دنیا میں قدم رکھا تو سرزمین کشمیر میں سکھ برسر اقتدار تھے۔ اگرچہ یہ حکمران فارسی زبان و ادب کی طرف اس قدر متوجہ نہیں تھے پھر بھی اس دور میں بہت سے شعراء وادباء نے نام پیدا کیا جن میں ملا بہاؤ الدین متو بھی سرفہرست ہیں۔

ملا بہاؤ الدین متو، ۸۱۱ھ بمطابق ۱۶۷۱ء میں سرینگر کے ایک محلہ پتوان معروف جامع مسجد کے نزدیک نوہٹہ میں پیدا ہوئے، ان کے والد محترم نور اللہ متو ہیں۔ یاد رہے متوان کے قبیلہ کا نام ہے اور یہ قبیلہ کشمیر میں بہت قدیم اور مشہور قبیلہ ہے۔ معروف عبدالحق، نصر اللہ، مفتی آیت اللہ، مولوی محمد انور اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ صاحب فتوحات قادریہ لکھتے ہیں۔ 'ملا بہاؤ الدین متو نے حضور عبدالرسول مدافروش، حضرت شاہ تار فروش، عنایت اللہ کبروی، عبدغنی لنکر، خواجہ؟ مقیم، شیخ اکبر آبادی اور ملا غلام محمد بلخی سے تعلیم و مدارج سلوک طے کیئے۔ ملا بہاؤ الدین متو نے دینی تعلیم اور تفسیر شیخ عنایت اللہ کبروی کے گھر میں ہی رہ کر حاصل کی۔ یہ ریاضت و عبادت میں دلچسپی رکھتے تھے اور عجیب سوز و گداز کے مالک تھے۔ ان کے علاوہ عبد الغنی لنکر سے بھی ارادت تھی، مثنوی ریشی نامہ میں اپنے مرشد کے باقرے میں یوں رقم طراز ہیں:

بہر پیر یک دستگیر من است

شیخ عبد الغنی پیر من است

بہر آن مر شد خدا آگاہ
آن کہ نشد از رہ عنایت شاہ

صاحب فتوحات قادریہ نے ملا بہاؤ الدین متو کے نام کے ساتھ لفظ آخوند لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ملا بہاؤ الدین متو آخوند موصوف درس و تدریس اور واعظ تھا۔ بلاخر ملا بہاؤ الدین متو نے سن ۸۴۲ھ بمطابق ۱۴۳۸ء میں وفات پائی اور اس امر سے صاحب فتوحات قادریہ، میر حسن منطقی، مولف تحائف الابرار، حاجی محی الدین مسکین متفق ہیں۔ ملا بہاؤ الدین متو کا شمار کشمیر کے بڑے بڑے شعراء میں ہوتا ہے، ذکر الصادقین اور خمسہ بہائیہ کا شمار ملا بہاؤ الدین متو کے آثار میں ہوتا ہے جن کی تفصیل ذیل میں درج ہے:

۱۔ ذکر الصادقین:-

یہ اولیاء کرام کا منظوم تذکرہ ہے جس میں ملا بہاؤ الدین متو نے صوفیاء کرام کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ یہ منظوم تذکرہ فارسی زبان و ادب کا بہترین سرمایہ ہے جو عرفانی مطالب سے پر ہے۔ اس کی زبان عم فہم اور آسان ہے۔

۲۔ خمسہ بہائیہ:-

اس میں ملا بہاؤ الدین متو کی پانچ مثنویاں درج ہیں جو شاعر نے نظامی گنجوی کی پیروی میں لکھی ہیں۔ اس میں پہلی مثنوی 'ربشی نامہ' ہے اور اس کے بعد مثنوی 'سلطانیہ'، 'غوثیہ'، 'نقشبندیہ'، اور 'چشتیہ'، ایک بعد دیگر رشتہ تحریر میں لائیں گئیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۳۔ ربشی نامہ:-

ملا بہاؤ الدین متو نے اس مثنوی میں شیخ نور الدین ربشی کے احوال نظم کیے ہیں اور یہ مثنوی چار ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

ای جہان مظهر صفات را
وی صفات شیون ذات را

اس منظومہ شاہکار کا آخری شعر ملاحظہ ہو:

ختم شد نامہ خامہ ماند از سر
روز قم ختم خاتمہ با لخیر

(۲)۔ سلطانیہ:-

مثنوی سلطانیہ میں سلطان العارفین محبوب العالم حضرت شیخ مخدوم حمزہ کے احوال قلم بند کیے ہیں یہ مثنوی تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے:

پر کش ای مرغ خوش تر
یک نوای خوش از فسانہ عشق

اختتام اس شعر سے ہوتا ہے

بارداز ذکر نیک مردان نور
قاری و سامعش شود مغفور

(۴)۔ غوثیہ:-

مثنوی غوثیہ میں غوث العظم شیخ عبدالقادر جیلانی کے احوال و واقعات و کمالات اور کرامات نظم کیے گئے ہیں۔ مثنوی غوثیہ میں ایک ہزار پانچ سو (۵۱۰۰) اشعار ہیں آغاز کا شعر ملاحظہ ہو:

ایب بہادتر دگر سر کن
روسوی طبلہ از فر کن

خاتمہ کا شعر ملاحظہ ہو:

کارم از دست رفت و دست از کار
شد بیرون اختیار یا غوث

(۵)۔ نقشبندیہ:-

اس مثنوی کا سال تصنیف ۶۶۲۱ھ ہے۔ اس مثنوی میں حضرت یوسف نقشبندی سے لیکر حضرت خواجہ عنایت اللہ نقشبندی تک کے احوال درج کیے گئے ہیں آغاز من رقم طراز ہیں:-

می زخم سر با وج نہ طارم
کہ کنم سر بد فتر چارم

آخر میں رقم طراز ہیں:

سال اتمام این درختم
ہاتھی گفتم ختم نامہ کنم

(۶)۔ چشتیہ:-

مثنوی چشتیہ میں ملا بہاؤ الدین متو نے سلسلہ چشتیہ کے احوال و کرامات کی تشریح کی ہے۔ اس مثنوی میں خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ سے حضرت ہاشمؒ اور باقی اس سلسلہ کے اولیا کرام کا تذکرہ کیا ہے۔ اس مثنوی کا آغاز درج ذیل شعر سے ہوتا ہے:

خامہ ام سر بہ سفر چمزد
رخت بر مہر ماہ و انجم زد

اس مثنوی کا اختتام ہی نہیں بلکہ خمسہ بہائیہ کا خاتمہ بھی اسی شعر سے ہوتا ہے اس شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے شاعر محبوب کی یاد میں مست ہے اب وہ باقی امور سے فارغ نظر آتے ہیں شعر ذیل میں درج ہے:

بیادت درلحد خوابیدہ بودم

قیامت شد مرا بیدار کردن

الغرض ملا بہاؤ الدین متو نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنفِ سخن میں شہرت پائی۔ جب مثنوی نگاری کو اپنا عنوان کلام قرار دیا تو اس میں خاصی شہرت پائی اور مثنوی نگاری کو اعلیٰ درجے تک پہنچایا۔ ملا بہاؤ الدین متو نے خمسہ بہائیہ میں نظامی گنجوی کی پیروی کی اور اپنے خمسہ کو خمسہ بہائیہ کا نام دیا۔

کتابیات

نمبر شمار کتاب	مصنف
۱۔ خمسہ بہائی	ملا بہاؤ الدین متو
۲۔ ربی نام	ملا بہاؤ الدین متو
۳۔ غوثی؟	ملا بہاؤ الدین متو
۴۔ نقشبندی	ملا بہاؤ الدین متو
۵۔ سلطانی	ملا بہاؤ الدین متو
۶۔ چشتی؟	ملا بہاؤ الدین متو
۷۔ ذکر صادقین	ملا بہاؤ الدین متو
۸۔ تذکرہ شعرائِ کشمیر	حسام الدین راشدی
۹۔ کثیر	جی۔ ایم۔ ڈی۔ صوفی
۱۰۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ	عبدالقادر سراری
۱۱۔ تاریخ حسن	پیر غلام حسن کھویامی
۱۲۔ واقعات کشمیر	خواجہ محمد اعظم دیدمری

☆☆☆

عہد مغلیہ کے تین سلاطین بہادر شاہ اول، محمد شاہ اور احمد شاہ کے درباری شعرا

تہتم رفیع، ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بہادر شاہ اول (۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۲ء)

اورنگ زیب عالمگیر کے معظم، اعظم اور کام بخش تین بیٹے تھے اورنگ زیب ایک دور اندیش انسان تھا اور ایک لائق جانشین کا خواہش مند تھا اسی لئے وہ اپنے بیٹوں کو نہ صرف میدان جنگ میں فنون سپاہ گری، آداب حکمرانی و رموز حکمرانی کی تعلیم دیتا بلکہ قلعہ معلیٰ کے اندر لکھنے پڑھنے کی تعلیم و تربیت دلاتا تھا اور ان کو طرز معاشرت کے آداب خود سکھاتا تھا یہ اس کی ہی کوشش کا نتیجہ تھا کہ معظم شاہ نے ایام طفلی میں ہی حفظ کلام اللہ کی سعادت حاصل کر لی تھی۔ فقہ، تفسیر و سلوک کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کرتا تھا اور عربی زبان میں عربی اور فارسی اور ترکی زبانوں میں اہل زبان کا ”ہم پلہ“ تھا۔ وہ نہ صرف فن خوشنویسی میں ماہر تھا بلکہ اس کو مختلف قسم کے خطوط میں کمال حاصل تھا اورنگ زیب کے انتقال کے بعد سلطنت ہند کا تاج محمد معظم شاہ کو حاصل ہوا اس نے شاہ عالم بہادر شاہ اپنا خطاب اختیار کیا۔۲

بہادر شاہ محمد معظم بن اورنگ زیب عالمگیر کی پیدائش ۱۰۵۳ھ میں ہوئی۔۳۔ بہادر شاہ اپنی بہت سی کمزوریوں اور اپنی حد سے بڑھی ہوئی صلح پسندی، نرم دلی، مروّت، فیاضی اور سیاست کی نا فہمی کے باوجود قابل ترجیح تھا۔ آپنے علم و فضل کے لحاظ سے تمام سلاطین تیموریہ میں ممتاز تھا۔ مگر عالمگیر کے بعد اس سلطنت کے بادشاہ میں جن دوسری صفات کی ضروریات تھیں وہ صفات اس میں مفقود تھیں اس نے چار پانچ سال کے مختصر سے زمانہ حکومت میں اپنی کمزوریوں سے ایسے اسباب پیدا کر دیئے جن کی بدولت اس کی وفات کے ہوتے ہی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔

شاہ عالمی عہد کے اختصار کے سبب سے دربار میں وہ فضا قائم نہ ہو سکی جو اس کے اسلاف کے زمانے میں تھی۔ بعض تذکرہ نگاروں نے معظم کا ذکر شاعر کی حیثیت سے کیا ہے اور بعض رباعیاں بھی اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں:

اعلیٰ تر از آنی کہ علی خوانندت والا تر از آنی کہ ولی دانندت
برہستی خود گواہ می خواست خدا بی مثل بیا فرید و بی مانندت ۴

مگر اس کا دربار علم و ہنر کی تابانی اور شعر و شاعری کی زمزمہ سنجی سے خالی رہا۔ گذشتہ عہد میں ایران سے علم و ادب کا جو سرچشمہ پھوٹا تھا وہ یکا یک خشک ہو گیا بلند پایہ شعراء اور قابل قدر فضلاء ناپید ہو گئے۔ قابل ذکر شعراء میں صرف عبدالقادر بیدل اور نعمت خاں عالی رہ گئے۔ مرزا بیدل دربار کی قصیدہ خوانی کرنا تنگ و عار سمجھتے تھے۔ شہزادہ معظم نے ایک بار قصیدہ کہنے کی فرمائش کی تو وہ دل برداشتہ ہو کر ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ اور باقی عمر فقر و توکل میں بسر کی۔ نعمت خاں عالی کو بہادر شاہ نے اپنے زمانے میں دانش مند خاں کے خطاب سے سرفراز کیا دانشمند خاں اس عہد کی منظوم تاریخ بہادر شاہ نامہ لکھ رہا تھا کہ اچانک اس کی وفات ہو گئی۔ اس میں بہادر شاہ کے صرف ابتدائی دو سال کے حالات کا ذکر ہے۔۵

مرزا مبارک اللہ، مرزا سید حسین، قزلباش خاں امید، عبدالقادر بیدل، نعمت خاں عالی اس کے دربار کے نامور شعراء ہیں۔

خلاصہ یہ کہ بہادر شاہ نے چار سال حکومت کی۔۶ اور اپنی زندگی کے آخری چند مہینے لاہور میں گزار کر ۲۰ محرم الحرام ۱۱۲۴ھ / ۲۷ فروری

۱۷۱۳ء میں لاہور میں ہی وفات پائی۔ اس کی وفات ہوتے ہی چاروں بیٹوں سلطان معز الدین مخاطب بہ جہاندارشاہ، و سلطان عظیم ملقب بہ عظیم الشان، سلطان رفیع القدر مشہور بہ رفیع الشان، سلطان اکبر ملقب بہ جہان شاہ میں تخت نشینی کے لئے جنگ ہوئی۔ بے معظم شاہ کے سب سے بڑے بیٹے نے ذوالفقار خاں کی مدد سے اپنے بھائیوں کو شکست دیکر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا اور خود جہاندارشاہ کا لقب اختیار کر کے شاہی تخت پر بیٹھا۔ وہ محض ایک سال ہی حکومت کر سکا۔ اس کے بعد اس کا چچا زاد بھائی اعظم کا بیٹا فرخ سیر تخت نشین ہوا لیکن اس کی مدت حکومت بھی بہت مختصر رہی۔ صرف چھ سال ہی میں ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک حکمرانی کر سکا۔ ۵

محمد شاہ (۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء)

محمد شاہ بن جہاں شاہ بن بہادر شاہ بروز جمعہ ۲۴ ربیع الاول ۱۱۱۳ھ (۱۸ اگست ۱۷۰۲ء) کو پیدا ہوا۔ ۹
عبداللہ خاں اور اس کا بھائی حسین علی تارخ ہند میں بادشاہ گر کے نام سے مشہور ہوئے ان کا باپ اورنگ زیب کے دربار میں ایک منصب دار تھا۔ دونوں برادر نے اپنی لیاقت سے اعلیٰ مراتب پائے۔ ۱۷۱۲ء میں بڑا بھائی عبداللہ خاں آ باد کا گورنر تھا اور حسین علی بہار کا۔ مغل امراء پران کا بہت گہرا سوخ تھا۔ انھوں نے جہاندارشاہ کے خلاف ایک سازش کی اور اعظم کے بیٹے فرخ سیر کی تخت نشینی کا اعلان پٹنہ میں کر دیا اس کے بعد وہ آگرہ پر حملہ آور ہوئے اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد دہلی پر بھی قابض ہو گئے۔ فرخ سیر ان کے لئے وہ سب کرتا تھا جو کہ وہ چاہتے تھے یعنی وہ ان کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی تھا سید برادران سے پریشان ہو کر اس نے ان کو مار ڈالنے کی سازش کی لیکن سید برادران بہت چالاک تھے انہوں نے ۱۷۱۹ء میں فرخ سیر کو قتل کر دیا اور اس کی جگہ رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کو تخت نشین کیا۔ اور ۱۷۱۹ء میں بہادر شاہ کے پوتے محمد شاہ کو تخت پر بٹھایا۔ ۱۰
محمد شاہ کو نو جوانی سے ہی حکومت میں کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ بیہودہ قسم کے مصاحبوں میں گھرا رہتا تھا اور اپنے وقت کو زیادہ تر فضول کاموں میں گزارتا تھا۔ حکومت کے تمام کاموں کو اپنے وزیر قمر الدین خاں بن محمد امین خاں پر چھوڑ دیے تھے۔ ۱۱
اگرچہ محمد شاہ اپنے پیشروں کی طرح کلنٹا اور بڑ دل ہونے کے باوجود وہ سید برادران کا عہد ختم کرنے میں کامیاب رہا۔ سید حسین علی کو قتل اور سید عبداللہ کو قید کر دیا تھا لیکن نادر شاہ (۱۷۰۹-۱۷۳۸ء) کا حملہ اس کے عہد کا اہم ترین واقعہ ہے جب اس نے دہلی کو تباہ و برباد کیا مغلوں کے قیمتی خزانے لوٹے اور مملکت کو بے جان کر کے رکھ دیا تھا۔ ۱۲

دہلی کی تباہی اور بربادی کا ذمہ دار صرف محمد شاہ ہی نہ تھا بلکہ اس وقت کے بڑے بڑے امراء و وزراء بھی اس تباہی و بربادی کے ذمہ دار تھے۔ اس تباہی کے اثرات پوری دہلی سلطنت پر اثر انداز ہوئے اور اس کے بعد جو نظام قائم ہوا اس نے علیحدگی پسندگی کے خیالات کی حمایت کی جو مغلیہ سلطنت کے زوال اور بہت سے خود مختار صوبوں کے قیام پر اثر انداز ہوئے۔ کشمیر بھی ان صوبوں میں سے ایک ہے۔ ۱۳
محمد شاہی عہد میں سیدوں کے قتل کے بعد خانہ جنگی کی کمی اگرچہ ضرور رہی مگر اس عرصہ میں وہ ساز و سامان آہستہ آہستہ جمع ہونا شروع ہو گیا جو ایک بڑی سلطنت کو تباہ و برباد کرنے کے لئے ضروری ہیں دربار میں اکبری شان و شوکت کی بجائے شیشہ و پیانہ کی بدستی تھی۔ شاہجہانی شان و شوکت کی جگہ حسرت و یاس نے لے لی۔ عالمگیری حشمت و جاہ کی جگہ بے کسی اور بے بسی کا عبرت ناک منظر تھا اور بادشاہ وقت اپنے درباریوں کے اشارہ پر چل رہا تھا خود غرض امراء تھے جو اپنی نیتوں میں پاکیزگی اور یکجہتی نہیں رکھتے تھے اور رہی سہی قوت نادر خاں کی جنگ اور مرہٹوں کے حملہ کے سبب تیموری بادشاہوں کی عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ختم ہونے کو تھی۔ سرسبز و شاداب گلشن ہمیشہ کے لئے ویران ہو رہا تھا۔ ایک شاندار تہذیب و تمدن کا شیرازہ

بکھر نے کو تھا۔ ۱۲

سلطنت کی شان و شوکت کے ساتھ ساتھ مغل بادشاہ اپنی زبان بھی کھو بیٹھے۔ فارسی زبان کی بجائے دربار اور عوام الناس میں ہندوستانی زبان کا اثر ہو رہا تھا۔ جب حکمران قوم کے ہاتھ سے سلطنت کی شان و شوکت اور باگ ڈور کے خاتمہ کے ساتھ زبان بھی زوال پذیر ہو رہی تھی خود محمد شاہ نے فارسی زبان کے بجائے ہندوستانی زبان کو اپنا زبانہ صرف نثری تصانیف ”بارہ ماسہ اور بگٹ کہانی“ لکھیں بلکہ اس زبان میں طبع آزمائی بھی کی۔

پیری میں نہ کس طرح کروں سیر جہاں کی دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گزری کا
کھول کر بند قبال کے تیں غارت کے کیا حصار قلب دلبر نے کھلے بندوں لیا
خوف سے مار کے یاراں اسے لرزاں نہ کرو زلف کا نام نہ لو اور پریشان نہ کرو ۱۵

اوپر دیے ہوئے اشعار کی زبان بہت زیادہ صاف ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستانی زبان اپنے آبائی وطن دکن سے شاہجہاں آباد آگئی اور اس زبان کا مشہور شاعر و کئی دہلی آئے اور ان کی شاعری کی شہرت ہر طرف ہوئی، محفلوں میں بھی ارباب نشاط ان کی غزلیں گاتے، سنتے اور سردھنتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی کے کہنہ مشق استادوں نے بھی اسی زبان ریختہ میں طبع آزمائی شروع کر دی جیسا کہ قزلباش خاں امید، میر عبدالقادر بیدل، سراج الدین علی خاں آرزو، مرزا علی قلی خاں ندیم اور مرزا مرتضیٰ قلی فراق جیسے باکمال فارسی شعراء نے بھی ریختہ میں شعر موزوں کیے۔ صرف یہی نہیں بلکہ چند دنوں میں ہی درباروں

مجلسوں اور بازاروں میں بھی فیضی، عرقی، نظیری، طالب، قدسی، صائب، کلیم کی جگہ سودا، میر درد، آثر، ذوق، مومن، اور مرزا غالب کی زمزمہ سنجیاں فردوس گوش ہونے لگیں، شعراء اپنی تمام جولانیاں ہندوستانی زبان میں دکھانے لگے ”شراب وہی تھی صرف شیشہ وساغر بدل گئے تھے“۔ شعراء وہی تھے صرف زبان بدل گئی تھی یعنی فارسی کی جگہ ہندوستانی زبان میں شعر گوئی شروع ہو گئی تھی۔ ۱۶

لیکن اس کے باوجود ہم محمد شاہ کے زمانہ کو اس لحاظ سے بھی ممتاز مانتے ہیں کہ اس میں علم و ادب کی سرپرستی ہوئی جیسے فارسی شعراء میں قزلباش خاں امید، واصل خاں واصل کشمیری، سلیمان قلی خاں داؤد، علی قلی خاں ندیم، شیخ سعد اللہ گلشن، مرتضیٰ قلی خاں فراق، سیرنٹس الدین فقیر، مرزا عبدالقادر بیدل، سراج الدین علی خاں آرزو، فائز، شہرت، صابر، مخلص، امین، انجام، بھاردہلوی، تراب، تمیز، ثابت، جولان، جامع کشمیری، حیرت، ثبات، حبیب اللہ دہلوی، خوشگو، دیدہ، ذوق، بلگرامی، زائر، ساغر دہلوی، سودا، قلی، عزت، متین، بکبت، یکتا، آثم، اسحق، علوی، حکیم بیگ خاں حاتم، نصرت اللہ خاں نیاز، سید سعد اللہ، محمد حسن خاں ساطع، محمد ہاشم عاجز، مرشد قلی خاں مخمور جیسے بڑے بڑے فارسی گو شعراء نے فارسی میں طبع آزمائی کی۔ ۱۷

ریختہ گوئیوں میں نواب عہد الملک نواب، عنایت خاں راسخ، نواب محمد شاکر خاں شاکر، خان عالی شان جعفر علی خاں، خواجہ ناصر عندلیب، شاہ حاتم، میر صاحب، جعفر زلی، مرزا مظہر جان جاناں اور ہندی شعراء میں اعظم خاں، دیوی کوی، صورت مسر وغیرہ موجود ہیں۔ ۱۸

محمد شاہ کی وفات پنج شنبہ کے دن ۲۷/ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ/۲۶/اپریل ۱۷۴۸ء کو ہوئی۔ اسے مقبرہ نظام الدین اولیاء کے صحن میں دفن کیا گیا اس بادشاہ کو ہم تیموری خاندان کا آخری بادشاہ کہہ سکتے ہیں جس نے دہلی میں تیس سال کی مدت تک حکومت کی۔ محمد شاہ کی وفات کے بعد دہلی مصیبت اور آفتوں کی آماجگاہ بن گئی اس کے بعد جو چند بادشاہ تخت نشین ہوئے وہ امرائے دربار کے ہاتھوں میں صرف کٹھ پتلی بنے رہے۔ ۱۹

احمد شاہ (۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء)

محمد شاہ کے انتقال کی خبر سنتے ہی فوج کے سرداروں نے سلطنت مغلیہ کا تاج احمد شاہ کو پہنا دیا تھا۔ ۱۲۰ اس کا دور حکومت محمد شاہ سے بھی بدتر تھا۔ ۱۲۱ اس نے تقریباً چھ برس تین ماہ اٹھارہ دن حکومت کی۔ ۱۲۲ اس کے دور حکومت میں سلطنت برائے نام رہ گئی تھی۔ اس نے عنان حکومت تو امرائے سلطنت کے حوالے کر دی اور خود عشرت پرستی میں مست رہنے لگا۔ ۱۲۳

کیم جنوری ۱۱۸۹ھ ۱۷۷۵ء کو انتقال ہوا۔ اور مقبرہ ملکہ مریم مکانی میں دفن کر دیے گئے۔
احمد شاہ عربی، فارسی، ہندی کے عالم اور ہندی شاعر تھے۔ احمد شاہ تخلص کرتے تھے۔ نمونہ کلام:

تو ہی مراد گرومن بھاون ۱۲۴

احمد شاہ نے بہت سے شعراء کی سرپرستی کی ان میں سے کچھ کے نام حسب ذیل ہیں۔ ان ہی میں سے ایک واصل خاں کشمیری بھی ہیں جو محمد شاہ کے بعد ان کے دربار سے نہ صرف بدستور وابستہ رہے بلکہ ان ہی کے عہد میں اس قدر جاہ مرتبہ حاصل کیا کہ ایک شاہی کوکھ سے واصل کی شادی ہوئی اور احمد شاہ کے مقربین میں شامل ہوئے ۱۲۵ واصل کا یہ شعر احمد شاہ کی مدح میں ہے:

خاک نقش پای حضرت شاہ احمد توتیاست

زان ملک مالند چشم خویش بر مژگان ما ۱۲۶

محمد فقیہ: دردمند تخلص تھا۔ ہندی اور فارسی شعر کی اصلاح میرزا مظہر سے لیتے تھے۔ انہوں نے ساقی نامہ ریختہ زبان میں کہی جو کہ بہت مشہور ہے۔ فارسی کے اشعار درج ذیل ہیں:

یار چوں لطف کند حوصلہ بیتاب شود خبر از شیشہ مگوئید کہ سنگ آب شود
این دل کہ چھ پیش توش اعتبار نیست لعلی است اینکہ در گرہ روز گار نیست
معلوم شد ز شعلہ آواز عندلیب آتش فتادہ است بہ باغ ایں بہار نیست ۱۲۷
شرف علی خاں: فغان تخلص تھا۔ اس کی پیدائش دہلی میں ہوئی اور احمد شاہ بادشاہ کا دودھ شریک بھائی تھا، ہندی اور فارسی دونوں زبان میں شعر کہے:

قاصد آخر دیدہ می آئی کہ گریبان دیدہ می آئی
دست را کی در از کردم من کہ تو دامن کشیدہ می آئی ۱۲۸

میرزا باقر: حقیر تخلص تھا۔ احمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ہندوستان آیا۔ فن شعر میں مہارت حاصل کرنے کے بعد اساتذہ کے دواوین جمع کیے اور مطالعہ میں مشغول ہو گئے اور جب شعر کہنے شروع کیے، میرٹھس الدین عباسی رحمۃ اللہ دہلوی سے اصلاح لیتے جن کی خواہش پر حقیر تخلص اختیار کیا:

من اسیر دام آن زلف دوتا خواہم شدن از پریشانی بہ صد غم بتلا خواہم شدن
پیروی کہ دلہا در خم زلفش پریشان شد نظر انداخت در آئینہ دیر خویش حیران شد ۱۲۹

کشن چند: اخلاص تخلص شاعری میں میرزا عبدالغنی بیگ قبول کے شاگرد تھے، احمد شاہ بادشاہ کے شروع عہد میں وفات پائی۔ فارسی کے درج ذیل اشعار سفینہ ہندی میں درج ہیں:

ہرگز مکدر از سخن کس نمی شوم آئینہ وار در دل صاف غبار نیست
اخلاص ، بسکہ بلبل رنگین ترانہ ام چوں من بہ باغ دھریکی از ہزار نیست ۳۰

شیراگلن خان: نام، باسطی تخلص تھا احمد شاہ بادشاہ کے آخری عہد میں لکھنؤ آئے اور خواجہ باسط علیہ الرحمہ کی دامادی اور مریدی حاصل ہوئی اور اپنے مُرشد کے نام کی مناسبت سے باسطی تخلص اختیار کیا :

رباعی

ہر کس ز علی بغض درون میدارد
خود راز در کرم برون میدارد
دانی کہ چرا کاخ شریعت برپاست
این خانہ دواز دہ ستون میدارد ۳۱

حواشی

- ۱۔ ہندوستان کی تاریخ، صفحہ ۳۰۵
- ۲۔ بزم تیموریہ، جلد سوم، صفحہ ۹۱-۱۰۰
- ۳۔ واقعات کشمیر، ص ۳۵۴
- ۴۔ بزم تیموریہ (جلد سوم)، ص ۹۳
- ۵۔ ایضاً
- ۶۔ تاریخ تحریک آزادی ہند، ص ۷۵
- ۷۔ ہندوستان کی تاریخ، صفحہ ۳۰۶
- ۸۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد ۵)، ص ۱۰۵
- ۹۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، صفحہ ۴۳۶۔
- ۱۰۔ ہندوستان کی تاریخ، صفحہ ۳۰۸، ۳۰۶
- ۱۱۔ تاریخ تحریک آزادی ہند (جلد اول)، صفحہ ۸۰
- ۱۲۔ تاریخ کشمیر اسلامی عہد میں، صفحہ ۲۲
- ۱۳۔ ایضاً
- ۱۴۔ بزم تیموریہ (جلد سوم)، صفحہ ۱۰۲
- ۱۵۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۳
- ۱۶۔ ایضاً
- ۱۷۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۴
- ۱۸۔ ایضاً
- ۱۹۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد ۱۹)، صفحہ ۴۳۶
- ۲۰۔ ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں، صفحہ ۲۷
- ۲۱۔ مغلیہ حکومت کا زوال، صفحہ ۳۴۳
- ۲۲۔ مسلمان حکمرانوں کی ہندی قدردانی، صفحہ ۱۹۳
- ۲۳۔ مغلیہ حکومت کا زوال، صفحہ ۲۴۳
- ۲۴۔ مسلمان حکمرانوں کی ہندی قدردانی، صفحہ ۱۹۳
- ۲۵۔ مقالہ غالب نامہ، صفحہ ۷۹-۷۸
- ۲۶۔ نسخہ واصل کشمیری، ورق ۳

۲۷	سفینہ ہندی، صفحہ ۷۷	۲۸	ایضاً
۲۹	ایضاً، صفحہ ۶۱	۳۰	ایضاً صفحہ ۲۱
۳۱	ایضاً، صفحہ ۳۲-۳۳		

منابع و ماخذ

- (۱) اُردو دائرۃ معارف اسلامیہ (جلد ۵/۱۹)، دانشگاه پنجاب، لاہور، ۱۹۲۲ء، نئی دہلی
- (۲) بزم تیوریہ (جلد سوم)، سید صباح الدین عبدالرحمن، ۱۹۹۱ء، اعظم گڑھ
- (۳) تاریخ تحریک آزادی ہند (جلد اول)، تارا چند، ۱۹۹۸ء، نئی دہلی
- (۴) تاریخ کشمیر اسلامی عہد میں، ڈاکٹر صابر آفاقی، ۱۹۸۸ء، لاہور
- (۵) سفینہ ہندی، بھگوان داس ہندی، ۱۹۵۸ء، پٹنہ
- (۶) مقالہ غالب نامہ (شمارہ نمبر ۱)، مدیر اعلیٰ پروفیسر نذیر احمد، ۲۰۰۷ء، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی
- (۷) مغلیہ حکومت کا زوال
- (۸) مسلمان حکمران کی ہندی قدردانی، محمد شفیع علوی کاکوروی، ۱۲۰۶ھ، لکھنؤ
- (۹) نسخہ واصل کشمیری، محمد واصل خاں کشمیری، حبیب گنج ۱۴۰/۴۷، علی گڑھ
- (۱۰) واقعات کشمیر، محمد اعظم دومی، مترجم شمس الدین احمد، ۲۰۰۱ء، سرینگر
- (۱۱) ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں، مولانا سید محمد میاں صاحب، ۱۹۷۸ء، دہلی
- (۱۲) ہندوستان کی تاریخ، ویش داس، ۱۹۵۸ء، دہلی

☆☆☆

استاد قمر جلالوی کی مرثیہ نگاری

یاسر عباس، ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی نو

تاریخ کائنات میں واحد واقعہ کر بلا ہی ایسا واقعہ ہے جو صدیاں گزرنے کے بعد بھی آج تک تازہ معلوم ہوتا ہے اور جو اس غم سے جڑ جاتا ہے وہ بھی زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔ واقعہ کر بلا کو جس جس نے بھی اپنے انداز میں بیان کیا انسانیت نے اس کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ واقعہ کر بلا کو سب سے پہلے حضرت امام حسینؑ کی ہمیشہ جناب ام کلثومؑ نے نظم کر کے غافل عوام کو یزید کے ظلم و ستم سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد عرب میں فرزدق و عدیل خزاعی نے اپنے الفاظ میں وارثین کر بلا کو تعزیت پیش کی۔ تو فارسی میں محتشم کاشانی و حسن کاشانی وغیرہ نے اس داستان غم کو نظم کا جامہ پہنایا۔ ہندوستان میں اولین مرثیہ گوان شعرا کو کہا گیا ہے کہ جن کے مرثیوں کو آج کی زبان میں نوحہ کہا جائیگا۔ اردو ادب کا پہلا عہد زریں میر تقی میر، میر حسن، میر درد، مرزا سودا، کے زمانے سیاح مرثیہ یعنی مسدس کی شکل میں لکھا جانے لگا۔ میر ضمیر اور میر خلیق نے اس فن کو آگے بڑھایا تو میر انیس و مرزا سیر کی کاوشیں اسے بام عروج پر لے گئیں۔ دبستان دیور و دبستان انیس نے مرثیہ نگاری کی اس قدیم روایت کو قائم رکھا جس میں مرزا اوج، صفیر بلگرامی، شاد عظیم آبادی، نفیس لکھنوی، وحید، عروج وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ جنگی ماحول کو بھول جانے کی بنا پر نئے جمہوری زمانہ کی ضروریات کے مد نظر پرانی روایات سے گریز کرنا پڑا۔ اس دور کے شعرا میں جہاں جوش ملیح آبادی، نسیم امروہوی، خبیر لکھنوی، جمیل مظہری وغیرہ ہیں تو ان میں ایک نام قمر جلالوی کا بھی ہے۔

قمر جلالوی کا تعارف مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔

”سید محمد حسین ہمدانی تخلص قمر ابن سید غلام حسین ہمدانی ۱۸۸۷ء کو علی گڑھ کے قصبہ جلالی میں متولد ہوئے۔ اجداد ہمدان سے ترک وطن کر کے ہندوستان آئے تھے۔ لہذا نام کے ساتھ ہمدانی بھی متصل کر لیا۔ تعلیم کی ابتدا قصبہ جلالی میں ہی کی قمر صاحب کے والد ایک زمیندار تھے لیکن اخراجات اس زمینداری کی حیثیت سے زیادہ تھے۔ استاد کا ایک شعر اس حالت کی عکاسی کرتا ہے۔

بنائے دے رہی ہیں اجنبی ناداریاں مجھ کو تری محفل میں ورنہ جانے پہچانے بہت سے ہیں (۱)

بچپن ہی سے شاعری کی تفریباً ساٹھ سال ہندوستان میں بسر کیے ان ایام میں استاد اپنی شہرت کے عرش پر پہنچ چکے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں آزادی کے بعد ترک وطن کر کے پاکستان چلے گئے۔ موصوف نے خاصی تعداد میں غزلیں، قصیدے، قطعات، رباعیات، سلام، سوز، منقبت، مرثیے کہے۔ استاد قمر جلالوی کی شہرت ان کی غزلیات کی بنا پر ہے اس کے باوجود استاد کے مرثیوں کی شہرت بھی کم نہیں۔

مرثیہ کی تعریف و ہیبت کے حوالے سے محققین کے مختلف اقوال ہیں۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب نے مرثیہ کی عمومی اور خصوصی حیثیت کا بیان ان الفاظ میں کیا ہے۔

”مرثیہ بالعموم اس نظم کو کہتے ہیں جس میں مرنے والے کی خوبیاں بیان کر کے اس کی موت پر افسوس کیا جائے۔ اور بالخصوص مرثیہ کا اطلاق اس نظم پر ہوتا ہے جس میں امام حسینؑ کی شہادت یا اس سے متعلق کوئی واقعہ غم انگیز پیرایہ میں بیان کیا جائے۔“ (۲)

امداد امام اثر نے مرثیہ کی وسعت کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

”مرثیہ نگاری سے مراد یہاں وہ مرثیہ گوئی نہیں کہ دوست داران خاندان پیغمبرؐ مصائب اہل بیتؑ کو شاعرانہ پیرایہ میں بیان کرتے ہیں بلکہ تمام ایسے دیگر منظوم بیانات جو سرمایہ رنج و الم کے باعث اظہارِ غم و حسرت کے احاطہ تحریر میں ہیں۔“ (۳)

مرثیہ کی مندرجہ بالا تعریف کی روشنی میں قمر جلالوی کے مراٹھی اپنی انفرادی حیثیت کے حامل ہیں۔ قمر جلالوی نے دونوں زمانے دیکھے۔ ایک زمینداری کا وہ دور جس میں لوگوں کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ ایک آزادی کے بعد کا وہ دور جسے کسمپرسی اور ذہنی کشمکش کا دور کہا جاسکتا ہے۔ اس دور میں اگر زمیندار ہندوستان میں رہ گئے تو زمینداری نکلنے کی بنا پر محلوں سے زمین پر آگرے۔ اور اگر پاکستان چلے گئے تو بھی ذہنی کشمکش کسی صورت کم نہ ہو سکی۔ زمینی کاغذات کی عدم موجودگی یا مکمل طور پر ثبوت نہ ہونے کی بنا پر پاکستان میں بھی اپنی جگہ بنانے میں ایک عرصہ لگ گیا۔ قمر جلالوی کیونکہ امیر مینائی کے شاگرد تھیں اس لئے ہندوستان میں ان کی عام شہرت اور چرچا تھا۔ لیکن گھریلو زندگی کسمپرسی کے عالم میں ہی گزرتی رہی۔ ان کی زندگی کی چھاپ ان میں ماثی میں دکھائی نہیں دیتی۔ البتہ سلاموں میں یہ شعور ضرور جاگتا نظر آتا ہے۔ ان کے مشہور مرثیہ کی کتاب ”تجلیاتِ قمر“ جو ”غم جادواں“ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس کتاب کی ترتیب مجاہد لکھنوی کے ہاتھوں ہے تو اہتمام طباعت انصار حسین واسطی نے اپنے ذمہ لیا۔ اس طرح ان دونوں کی کاوش اور استاد کی صاحبزادی محترمہ کنیر فاطمہ اور اپنے دور کے مشہور و معروف ذاکر حسین علامہ رشید ترائی کی تجویز پر یہ مراٹھی شیخ شوکت علی اینڈ سنس نے شائع کیے ہیں۔

اس کتاب میں استاد قمر جلالوی کو میر ثانی تحریر کیا گیا ہے۔ دراصل یہ لقب غزلیات قمر جلالوی کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ مرثیہ میں ان کی حیثیت بہت زیادہ پائیدار نہیں ہے۔ جہاں وہ غزلیات میں اپنے دور کے اکثر بڑے شعراء پر سبقت لے گئے ہیں وہیں مرثیہ کے میدان میں جوش ملیح آبادی، آل رضا، نسیم امر و ہوی، مہذب لکھنوی، جمیل مظہری اور نجم آفندی وغیرہ کے برابر نظر نہیں آتے۔ اس کے باوجود اپنی سلیس اور شگفتہ زبان کی بنا پر وہ اپنی بات کہنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ان کے مرثیے عام طور پر ساٹھ سے زیادہ بندوں پر مبنی نہیں ہیں۔ صرف ایک مرثیہ ۸۰ کے عدد کو چھو سکا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس دور کو اختصار کا دور کہا جاتا ہے۔ بڑے سے بڑے مضمون کو کم سے کم الفاظ میں باندھنا جدید دور کی افادیت ہے۔ یہی وہ دور ہے جس میں ناول افسانے میں، افسانہ افسانچہ میں اور افسانچہ تین چار لائن کی بات میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اس کے باوجود غم کر بلا ایسا حادثہ ہے جسے یاد کرنے کے لیے مسلمان وقت کی قیمت مقابلے میں ثواب اخروی کی طرف مائل رہتے ہیں۔ اور ماہِ محرم میں خاص طور پر اپنے وقت کو غم کر بلا کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ اسی لیے ہر جلسہ میں خضار کی جھلک ہونے کے باوجود مجلس و ماتم امام مظلوم کر بلا میں کوئی کمی نہیں دیتی بلکہ اس میں مزید اضافہ و ترقی نظر آتی ہے۔

قمر جلالوی اپنے دور کے صف اول کے شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ غزل کے شاعر ہیں اسی لیے غزل کی طرز میں غم کر بلا کی کیفیت بیان کرنے والی صنف ”سلام“ میں ان کو ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ موصوف کے سلام اردو کے کسی بھی سلام کہنے والے شاعر کے مقابلے میں پیش کیے جاسکتے ہیں چاہے وہ میر انیس ہی کیوں نہ ہو سکے۔ ان کے سلاموں کو بھی وہی شہرت حاصل ہوئی جو انیس و دبیر کے حصہ میں مخصوص تھی۔ مثلاً ان کا سلام

تم نے کیا پیدائش حیدر سے بھی جانا نہیں اے بتوں اللہ کا گھر ہے یہ بت خانہ نہیں (۴)

یا

بیٹھا ہے مشکلات کے رستے پہ ہار کے اوبد نصیب دیکھ علی کو پکار کے (۵)

وغیرہ سلام ہندو پاک میں برپا ہونے والی مجالس کی زینت بنتے ہیں اور سوز و سلام کے درمیان اکثر امام بارگاہوں کسی نہ کسی روز سننے کو مل جاتے ہیں۔ ایک جگہ سلام کے مقطع میں حدیث رسول (اولنا محمد و اوسطنا محمد و آخرنا محمد و کلنا محمد) کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے۔

اول و آخر محمد ہی محمد ہیں قمر اس گھرانے میں سوال بیش و کم ہوتے نہیں (۶)

صنف مرثیہ میں بھی قمر جلالوی نے اپنی ایک پہچان بنانے کی کوشش کی ہے۔ بقول طاہر حسین کاظمی۔

”قمر جلالوی کے مراٹھی کے مطالعہ کے بعد ان کے کلام میں محاسن شعری کا اعتراف ہر سخن فہم اور حقیقت پسند انسان کو کرنا پڑے گا۔ عناصر مرثیہ کی بڑی حد تک پابندی کے باوجود اپنے کلام میں جدید رنگ اور آہنگ کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ طرہ امتیاز یہ کہ موضوع سے نہیں بھگتتے۔ واقعات کے بیان میں طوالت سے گریز کرتے ہوئے اختصار کے ساتھ واقعات کا بھرپور لطف پیدا کیا۔“ (۷)

طاہر کاظمی کے مندرجہ بالا بیان میں ”عناصر مرثیہ کی بڑی حد تک پابندی کے باوجود“ کو کہ موصوف نے بڑی حد تک کے ذریعہ خود کو پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مرثیوں میں سب سے بڑا امتیاز سہل متمتع کا استعمال ہے۔ جس کے لیے میر انیس کی شہرت ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ میر انیس کے یہاں بھی

نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری یا جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے

جیسے بہت سے مرثیے موجود ہیں۔ جنہیں سہل متمتع کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ قمر جلالوی کے غم جاوداں میں دیے گئے دسوں مرثیے سہل متمتع کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ لہذا مفتی سید نصیر الہ جتہادی کے اس قول میں مکمل صداقت نظر آتی ہے۔

”سہل متمتع کا تصور جس طرح قمر کی شاعری حقیقت بنا ہے اس کی مثال دوسری جگہ نظر آنا مشکل ہے۔“ (۸)

اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے سید طاہر کاظمی کا قول بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔

”قمر کا اسلوب مرثیہ نگاری نہایت سادہ، رواں اور سہل ہے تخیل آفرینی اور صنایع و بدائع کا ایک حسین امتزاج ان کی شاعری میں اپنی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔“ (۹)

در اصل جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے قمر جلالوی بنیادی طور پر غزل و سلام کے شاعر ہیں۔ اسی لیے ان کو ان کی غزلیات کی بنا پر ”میر ثانی“ پکارا گیا۔ البتہ ان کے مرثیے دور حاضر کی زبان کی عکاسی کرتے ہوئے فارسی و عربی سے نابلد مجمع کے سامنے بھی پیش کیے جاسکتے ہیں۔ وہ آزادی کے بعد جتنے سال بھی زندہ رہے اس دور میں انہوں نے اندازہ لگالیا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہونے کے باوجود بھی یہ تمام اہل پاکستان کو ان کی قومی جبلت کی بنا پر جوڑنے میں ناکام رہے گی۔ اسی لیے انہوں نے آسان سے آسان تر زبان استعمال کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ شاعر کو تلمیذ خدا بھی کہا گیا ہے لہذا وہ الہامی طور پر آنے والے دار کے سامعین کی ذہنیت و استعداد کا اندازہ لگالیتا ہے۔ اسی لیے غم جاوداں جس میں مندرجہ ذیل دس مرثیے ملتے ہیں۔

ان کے تمام مراٹھی کو جو امتیاز دوسرے مرثیہ نگاروں کے مقابلے میں الگ شناخت دیتا ہے وہ ان کے ”ساقی نامے“ سے متعلق اشعار ہیں۔ یا بے ساختہ موزوں ہونے والی بیتیں ہیں۔ کہیں کہیں تو ان کی بیت میر انیس کی بیٹیوں کے ہمراہ دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً میر انیس کی ایک مشہور بیت صنعت حسن تغلیل کی پیش کی جاتی ہے۔

پیاسی جوتھی سپاہ خدا تین رات کی
ساحل پہ سر پکٹی تھی موجیں فرات کی
اب قمر جلالوی کی بیت دیکھے۔

پانی جونہر کانگہ صف شکن میں ہے
موجوں کا ہے یہ حال کہ ریشہ بدن میں ہے (۱۰)
دونوں میں کیفیت یہ ہے کہ انیس کے شعر میں موجوں کو ساحل تک آنے کی ضرورت ہے لیکن قمر جلالوی کی بیت کے مضمون کو جب بھی آپ نگاہ کریں گے تو پانی کو ہلتا ہوا پائیں گے جسے ریشہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں یہ تو نہیں کہا جاسکتا وہ مرثیہ گوئی میں میر انیس سے بہتر شاعر ہیں لیکن یہ بیت اس اور اس بیت کا مضمون صنعت حسن تعلیل کے لیے کرشمہ سازی کا کام کر رہی ہے۔ غم جاودان کے چوتھے مرثیہ کے ۳۷ تا ۳۹ ویں بند کے ملاحظہ کیجئے۔ ساقی نامہ کی نہایت عمدہ مثال ہیں۔

ساقی گھٹائیں چھا گئیں لا بھر کے جام لا
پیاسہ ترا زہیر ہے دریا دلی دکھا
مالک تو خشک و تر کا ہے تجھ کو کمی ہے کیا
فضل خدا سے ہیں ترے میخانے جا بجا
جب ہر جگہ ہے بادہ کشی سر نوشت میں
کوثر کی بات آکے کریں گے بہشت میں
ساقی سدا ہے تیری نوازش پہ سب کو ناز
جی بھر کے وہ پلا جسے کہتے ہیں کعبہ ساز
اپنے زہیر کو تجھے کرنا ہے سرفراز
جھک جائے اتنا بار کرم سے سر نیاز

دریا دلی کو دیکھ کے خود جھومنے لگے
ہاتھوں کے بدلے تیرے قدم چومنے لگے
ساقی ہے تیرے بودہ کشوں میں یہی رواج
چھوڑیں ملا کے خاک میں باطل کا تخت و تاج
دیکھ اپنے ایک پرانے شرابی کی جنگ آج
ہوتا ہے مئی کی طرح سے میخوار کا مزاج
پیری نہ کیسے باعث فخر شباب ہو
ہوتی ہے تیز جتنی پرانی شراب ہو (۱۱)

آخری بیت میں جو شراب کے مزاج سے بزرگی و پیری فخر شباب کہا ہے اسکی نظیر محال ہے یعنی جس طرح سے جتنی پرانی شراب ہوتی ہے اتنی ہی تیز ہوتی ہے اسی طرح جتنی بزرگی ہوگی اتنی شباب پر سبقت لیے ہوگی۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کے مراثی میں ”ساقی نامہ“ کا ایک خاص امتیاز رکھا جاتا ہے اس کے لیے اجزاء مرثیہ کی کوئی قید نہیں۔ غم جاودان کے پہلے مرثیہ (جب فتح ملک کو کیا آفتاب نے) جو حبیب ابن مظاہر کے احوال میں ہے۔ ۵۱ بندوں کے اس مرثیہ میں بیالیسویں بند میں اس طرح رطب اللسان ہیں۔

ساقی زبان سوکھ گئی ہے شراب لا
خوشبو میں ہو جو غیرت مشک و گلاب لا

پیری کو جو کہ بخش دے رنگ شباب لا طے کر چکا ہوں منزل راہ جواب لا

پھولوں میں رکھ کے جام دے مجھ خوش نصیب کو

پہنچا کے آ رہا ہوں جہاں میں حبیب کو (۱۲)

حبیب ابن مظاہر کے اس مرثیہ میں قمر جلالوی حبیب ابن مظاہر کے ذریعہ امام حسینؑ کے پیغام اور مقصد کو پہنچانے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ اس بند سے ”دو شہزادوں کی جنگ“ کہنے والوں کے منہ پر تالا لگانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

وہ کام ہو کہ حکم ہو جس کام کے لیے اللہ اور رسولؐ کے پیغام کے لیے

لڑنا نہیں ہے سلطنت و نام کے لیے قربانی دیتے آتے ہیں اسلام کے لیے

صابر ہیں ہم نظر نہیں رکھتے ہیں دھر پر

تاریخ میں نہ ہو کہ لڑائی تھی نہر پر (۱۳)

مندرجہ بالا ایک ہی بند میں کربلا کے پورے فلسفہ کو اس طرح بیان کرنے کی کوشش کی ہے جیسے کوزے کو سمندر بند کر دیا ہو۔ مثلاً مسلمان کو وہ ہی کام انجام دینا چاہیے جس کے لیے اللہ کا حکم ہوا ہے۔ یعنی قرآنی احکام کو رائج کیا جائے اور اللہ و رسولؐ کے پیغام کو دنیا میں عام کیا جائے تاکہ ایک صالح معاشرہ سامنے آئے۔ بنی امیہ کی حکومت جبر و استبداد پر مبنی ہوئی تھی اور اسلامی نظام کو ملوکیت کی طرف دھکیل رہی تھی۔ اسی لئے اس نظام کی نفی کرنے کے لئے تیسرے مصرعہ میں واضح کر دیا گیا

”لڑنا نہیں ہے سلطنت و نام کے لیے“

یہ تہا مصرعہ ہی تمام تاریخ اسلام پر حسینی نظریہ کو واضح کر رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے۔

”قربانی دینے آئے ہیں اسلام کے لیے“

یعنی اسلام کے لیے لڑنے نہیں آئے ہیں بلکہ اسلام بچانے کے لیے قربانی دینے آئے ہیں۔ قمر جلالوی نے ایک ایک لفظ کو ہیرے کی طرح جڑنے کی کوشش کی ہے اور ایک ہی مصرعہ میں اپنی بات مکمل کر دی ہے۔ اب قربانی دینے کے لیے اس کے نتیجہ میں ظالم و جابر کی طرف سے جو اعتراضات ہو سکتے تھے ان کا جواب بھی بیت میں دے دیا گیا۔ قرآن نے کہا ہے۔ ”ان اللہ الصابرين“ بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ لہذا شاعر نے بتا دیا کہ کربلا صابر ہیں۔ ان کی نظر حکومت پر نہیں ہے۔ کیونکہ حدیث رسولؐ ہے ”علی مع الحق والحق مع علی“ علی حق کے ساتھ ہے اور حق علی کے ساتھ ہے۔ اور علیؑ یا حسینؑ ابن علیؑ ایک ہی مقصد کے حامل ہیں اور کلنا محمد والی حدیث کے تحت دونوں اپنے اپنے وقت کے محمد ہیں۔ تو اسلام بچانے کے لیے دفاعی جنگ تو ہونا ہے۔ لیکن کئی دن کے پیاسے ہونے کے باوجود کسی صورت بھی اس جنگ کا رخ حصول آب کے لیے نہیں ہونا چاہیے اسی لیے فیصلہ سنا دیا گیا۔

”تاریخ میں نہ ہو کہ لڑائی تھی نہر پر“

اسی کو کوزی میں سمندر سمانا کہا جاسکتا ہے کہ ایک ہی بند میں قمر جلالوی نے پورا فلسفہ بیان کر دیا ہے۔ مآل مرثیہ رقت یا بین سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قمر جلالوی کی طبیعت میں شاید غم کربلا کو بیان کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ اسی لیے اکثر مرثیوں میں یہ عنصر دوسرے مرثیہ گو حضرات کے مقابلے میں کمزور نظر آتا ہے۔

شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ شدت غم کی بنا پر ان کا ذہن اتنا رنجیدہ و افسردہ ہو جاتا ہو کہ اس غم کو الفاظ میں پرونے کی سکت نہ کر پاتا ہو اور ان کا حساس دل اس غم برداشت کرتے کرتے نڈھال ہو جاتا ہو۔ کیا نلکہ آل مجلس مرثیہ کا یہی حصہ کہا جاتا ہے لہذا امام حسینؑ کے حال میں کہے گئے آٹھویں مرثیہ (روشن ہو جو بام فلک پر چراغ شب) جو ۳۶ بندوں پر مشتمل ہے امام حسینؑ کی یکسی کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

رخصت حرم سے ہو کے جو نکلے شہ انام دیکھا کھڑا ہے عالم غربت میں خوش خرام
رن میں پڑے ہوئے ہیں زمیں پر فلک مقام بولے غریب و بیکس و لاچار کا سلام
سب چھوڑ بیٹھے فاطمہ کے نور عین کو اٹھو کوئی سوار کرا دو حسین کو
ہر ایک کو پکار رہے ہیں شہ ہدی عباس و قاسم و علی اکبر اٹھو ذرا
آتے نہیں ہو عون و محمد ہوا ہے کیا زینب نے جب سنی شہ مظلوم کی صدا
نکلی رکاب تھامنے کو اپنے بھائی کی مشکل کشا کی بیٹی تھی مشکل کشائی کی (۱۴)

المختصر مراثی استاد قمر جلالوی کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے آل مرثیہ یعنی مصائب کی ہونے کے باوجود دور جدید کی تمام تر خصوصیات و ضروریات یعنی اختصار استاد کے مراثی میں موجود ہے۔ آپ کی متاثرات و تشبیہات بے حد خوبصورت ہیں۔

ماخذ:

- ۱۔ رشک قمر۔ از قمر جلالوی ص ۱۵۱
- ۲۔ روح انیس، سید مسعود حسن رضوی ادیب، ص ۱۸
- ۳۔ کشف الحقائق، امداد امام اثر ص ۱۵۸
- ۴۔ غم جاوداں، مرتب مجاہد لکھنوی، ص ۵۳، مطبع شیخ شوکت علی اینڈ سنس پاکستان چوک کراچی ۱۹۷۸
- ۵۔ غم جاوداں، مرتب مجاہد لکھنوی، ص ۴۰، مطبع شیخ شوکت علی اینڈ سنس پاکستان چوک کراچی ۱۹۷۸
- ۶۔ غم جاوداں، مرتب مجاہد لکھنوی، ص ۵۴، مطبع شیخ شوکت علی اینڈ سنس پاکستان چوک کراچی ۱۹۷۸
- ۷۔ اردو مرثیہ میر انیس کے بعد، سید طاہر حسین کاظمی، ص ۱۹۰/۱۹۱ نین آرٹ پرنٹرز ۱۵۳۴، گلی قاسم جان۔ دریا گنج دہلی۔ ۱۹۹۷ء
- ۸۔ غم جاوداں، مرتب مجاہد لکھنوی، ص ۱۹، مطبع شیخ شوکت علی اینڈ سنس پاکستان چوک کراچی ۱۹۷۸
- ۹۔ اردو مرثیہ میر انیس کے بعد، سید طاہر حسین کاظمی، ص ۱۹۳/۱۹۴ نین آرٹ پرنٹرز ۱۵۳۴، گلی قاسم جان۔ دریا گنج دہلی۔ ۱۹۹۷ء
- ۱۰۔ غم جاوداں، مرتب مجاہد لکھنوی، ص ۹۱، مطبع شیخ شوکت علی اینڈ سنس پاکستان چوک کراچی ۱۹۷۸
- ۱۱۔ غم جاوداں، مرتب مجاہد لکھنوی، ص ۱۶۵، مطبع شیخ شوکت علی اینڈ سنس پاکستان چوک کراچی ۱۹۷۸

- ۱۲۔ غم جاوداں، مرتب مجاہد لکھنوی، ص ۸۳، مطبع شیخ شوکت علی اینڈ سنس پاکستان چوک کراچی ۱۹۷۸
- ۱۳۔ غم جاوداں، مرتب مجاہد لکھنوی، ص ۸۲، مطبع شیخ شوکت علی اینڈ سنس پاکستان چوک کراچی ۱۹۷۸
- ۱۴۔ غم جاوداں، مرتب مجاہد لکھنوی، ص ۲۹۱، مطبع شیخ شوکت علی اینڈ سنس پاکستان چوک کراچی ۱۹۷۸



مولانا شبلی نعمانی کی تاریخی تصانیف پر ایک نظر

رضیہ سلطانہ، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مولانا شبلی نعمانی (1887-1914) ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے مختلف کارناموں کے سبب کافی شہرت حاصل کی لیکن ان کی شہرت میں ایک اہم حصہ ان تصانیف و تحریرات کا ہے جو انھوں نے سوانح، تاریخ، ادبی، سیاسی، تعلیمی اور فلسفیانہ موضوع پر لکھیں۔ ان تصانیف میں تاریخی کتب اور سوانح عمریاں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں جو کافی مشہور و مقبول ہوئیں۔ شبلی نے لکھنے کا سلسلہ تو کم عمری میں ہی شروع کر دیا تھا اور علی گڑھ آنے سے پہلے سے ان کی دو تصانیف شائع ہو گئیں تھیں مگر ان تصانیف کا موضوع فقہ کے فروعی مسائل تھے۔ اسلامی تاریخ سے دلچسپی شبلی کو علی گڑھ آنے کے بعد ہوئی یہاں ان کو ایک بڑی تعداد تاریخی کتب کی ایک جامل گئی تھی اس کے بارے میں خود شبلی فرماتے ہیں۔ ”تصانیف کا شوق ابتداً مجھے ان تاریخی تصنیفات کے دیکھنے سے ہوا تھا جو یورپ میں چھپی تھیں اور ایک موقع پر مجھ کو بہت سی ایک جاملی تھیں جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔“ ان کتب کے ذریعے وہ یورپین مصنفین کے طرز نگارش اور علمی تحقیقات سے متعارف ہوئے۔ صرف ان کتابوں نے ہی شبلی کی تصانیف میں اپنا کردار ادا نہیں کیا بلکہ علی گڑھ کے علمی و ادبی ماحول نے بھی انھیں تصنیفی کام کے لئے ابھارا مزید برآں اس کام میں آپ کو سرسید کا بھی بھرپور تعاون ملا، انھیں تمام باتوں کا نتیجہ تھا کہ علی گڑھ قیام کے دوران آپ کی کئی مایہ ناز تصانیف منظر عام پر آئیں اس کے بعد آپ جہاں بھی گئے تصانیف کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔

مولانا شبلی کی زیادہ تر کتب کو تاریخی تصانیف اور سوانح نگاری دونوں قسم کی فن کی کتابوں میں رکھا جاسکتا ہے کیونکہ آپ نے ان عظیم ہستیوں کی سوانح لکھیں جو اسلامی تاریخ کا حصہ تھے۔ مولانا شبلی کا رائل کے اس نظریے کے قائل تھے کہ تاریخ غیر معمولی شخصیتوں اور ناموروں کے غیر مختتم سلسلے کا نام ہے۔ شبلی کی سوانح بھی تاریخ کا رنگ لئے ہوئے ہیں ان سوانح کا مقصد محض کسی شخص کی سوانح لکھنا نہیں تھا بلکہ شبلی ان سوانح کے ذریعے مسلمانوں کو ان کے ماضی کے تابناک پہلوؤں سے روشناس کرانا چاہتے تھے اور ان کو آباء و اجداد کی ہمت افزاں داستانیں سنا کر ان کے دل سے پستی کے احساس کو ختم کرنا شبلی کا مقصد تھا۔

شبلی نعمانی تاریخ نویسی کے لئے تحقیق، تدقیق اور تعدیل پر بہت زور دیتے ہیں ان کے نزدیک تاریخ نویسی کے لئے یہ چیزیں جزو ایمان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شبلی نعمانی اپنی کتابوں کے لئے مواد اس موضوع کی بنیادی اور مستند کتابوں سے لیتے ہیں۔ شبلی کا ماننا ہے کہ مورخ کا اصلی فرض یہ ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ ان کے مطابق تاریخ اور انشاء پر دازی کی حدیں بالکل جدا ہیں۔ شبلی کے نزدیک مورخ کو اسباب و علل کا سلسلہ ملانے کے لئے قیاس اور اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے مگر اس میں مورخ کو اعتدال اور احتیاط کے دامن کو نہیں چھوڑنا چاہئے اور واقعات کو ترتیب دینے کا مقصد پہلے سے طے شدہ مطلب حاصل کرنا نہ ہو۔ شبلی کی تصانیف میں تحقیق و استدلال کے ساتھ ظرافت کا عنصر بھی کہیں کہیں ملتا ہے جو ان کی تصانیف کو اور نمایاں بناتا ہے ان کی زبان سادہ اور سلیس ہے جو قاری کے ذہن پر اثر چھوڑتی ہے۔

شبلی کی تصانیف ماضی کی عظیم شخصیات کی سوانح ہیں مگر اس کے باوجود شبلی نے اپنے ہیر و کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریوں کو بھی دکھانے کی کوشش کی ہے اور وہ انھیں انسانی لغزشوں سے ماوراء دکھانا نہیں چاہیے بلکہ ایک سادہ اور بشری تصویر کشی کرنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اب شبلی کی ان تصانیف کا ذکر کیا جائے گا جو اسلامی تاریخ کی ان اہم شخصیات کی سوانح ہیں جو اپنے طبقے میں عظمت حکومت کے اعتبار سے اپنا ہم سر نہیں رکھتے تھے۔

المامون

شبلی کی پہلی تاریخی تصنیف المامون تھی جو 1889ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب آپ نے علی گڑھ قیام کے دوران لکھی اور کالج کی جانب سے اسے شائع کیا گیا۔ یہ تصنیف اتنی مقبول ہوئی کہ چند مہینوں میں ہی پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا اور اسے دوبارہ چھاپا گیا۔ اس کتاب کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے، کتاب کے پہلے حصے میں معمولی واقعات، خانہ جنگیوں، بغاوتوں اور ملکی فتوحات کا ذکر ہے۔ امامون کے ذاتی کمالات اور کارناموں کا ذکر کتاب کے دوسرے حصے میں کیا گیا ہے اور یہی کتاب کا اہم حصہ ہے۔ شبلی نے اس کتاب کے مواد کو جمع کرنے میں بڑی مشقت اٹھائی کیونکہ قدیم مورخین کسی عہد کے تہذیب و تمدن کے حالات و واقعات کو قلم بند کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے اس لئے شبلی نے بڑی کوشش کر کے مختلف کتابوں سے وہ مواد جمع کیا جو اس کتاب کو نمایاں بناتا ہے سید عبداللہ کا ماننا ہے۔ ”مامون کے زمانے کی معاشرت اور دارالسلام بغداد کی تہذیب عصری کا اس سے بہتر مرقع شاید کسی اور کتاب میں موجود نہ ہوگا شاید مشہور عربی کتاب عصر المامونی سے بھی بہتر۔“

مامون کی شخصیت میں بہت سی خوبیاں تھیں جن کا ذکر شبلی نے کیا مگر ان کی نظر مسلسل تاریخ پر جمی رہتی ہے اور شبلی ان واقعات سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں جو تاریخ کا حصہ ہیں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ المامون محض مامون کی سوانح نہیں ہے بلکہ اس کے دور کی تاریخ ہے۔

شبلی نے اپنی اس کتاب میں اشخاص کی نفسیات اور ان کی جذباتی کیفیات کا بیان بہت عمدہ طریقہ سے کیا ہے۔ شبلی اپنی اس کتاب میں غیر جانب دار رہنے کی کوشش کرتے ہیں جو مورخ کا ایک اہم فرض ہے شبلی اپنے ہیرو کو حقیقت کی حدیں لگاتے ہوئے عظیم دکھانے کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ حقیقت کے دامن کو نہیں چھوڑتے اور مامون کی خوبیوں کے ساتھ اس کی برائیاں بھی بیان کرتے ہیں۔ سرسید کے مطابق المامون میں ”جو خوب صورت ہے خوب صورت ہے جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے نہ خوب صورتی کو زیادہ خوب صورت بنایا ہے نہ بھونڈے پن کو زیادہ بھونڈا اور درحقیقت یہی کمال تاریخ نویسی ہے۔“

شبلی المامون میں صرف اپنے ہیرو کی عظمت کے گن ہی نہیں گاتے رہتے بلکہ وہ دوسری شخصیتوں کے بھی ایسے واقعات پیش کرتے ہیں جن سے ان کی عظمت کا اعتراف ہوتا ہے۔ مثلاً ملکہ زبیدہ سے متعلق ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ ”جب امین کی فوج کا سپہ سالار علی بن عیسیٰ مامون کو گرفتار کرنے جانے لگا تو اسے زبیدہ نے چاندی کی زنجیر مگنا کر دی کہ مامون گرفتار ہو تو اس میں مقید کر کے لانا اس کے ساتھ یہ نصیحتیں کیں کہ امین اگرچہ میرا لخت جگر ہے تاہم مامون کا بھائی ہے حق ہے تم جانتے ہو وہ کس کا بیٹا اور کس کا بھائی ہے۔ گرفتار ہو تو پاس ادب ملحوظ رکھنا سخت کہے تو برداشت کرنا راہ میں رکاب تھام کر چلنا کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔“

مامون کا دور اپنی علمی ترقیوں کے سبب مسلمانوں کی حکومت کا عہد زریں تھا مگر شبلی نے ان علماء کا تذکرہ بہت مختصراً کیا ہے اور ان کی کتاب کے چند صفحات میں ہی ان علماء کے کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ المامون ایک عمدہ سوانح ہے اور اردو تاریخ نویسی کا ایک اہم حصہ ہے اس میں مانون کے ساتھ ساتھ اس کے دور کے حالات اور تہذیب و تمدن کے بارے میں کافی معلومات فراہم کی گئی ہے۔

سیرۃ النعمان

مولانا شبلی کی المامون کے بعد جو دوسری تصنیف شائع ہوئی وہ سیرۃ النعمان تھی اس کتاب کی تعریف میں سید عبداللہ کہتے ہیں: ”اردو میں کیا مشرق کی سب زبانون میں یہ کتاب اپنے موضوع پر جدید طرز تصنیف اور جدید انداز تصنیف کا اولین نمونہ ہے۔“^۸

شبلی کے دل میں جب یہ خیال پیدا ہوا کہ علمی ناموروں کے بارے میں لکھا جائے تو ان کی سب سے پہلے نظر حضرت امام ابوحنیفہ پر پڑی جن کے وہ ہمیشہ سے عقیدت مند رہے تھے اسی بناء پر ان کے استاد فاروق چڑیا کوٹی نے ان کے لئے نعمانی کا نام تجویز کیا تھا۔ حالانکہ مولانا نے المامون کے بعد الفاروق لکھنے کی شروعات کی تھی مگر مختلف وجوہات کی بناء پر انھیں اس کام کو کچھ عرصہ کے لئے روکنا پڑا اور اس دوران آپ سیرۃ النعمان لکھنے کی طرف متوجہ ہو گئے اس کا اظہار خود مولانا شبلی نے سیرۃ النعمان میں کیا ہے مولانا نے 1889ء میں اس کتاب کی بنیاد ڈالی اور اس سال کے آخر میں اس کا پہلا حصہ مکمل ہو گیا اور دوسرا حصہ دسمبر 1890ء میں تکمیل کو پہنچا اور 1891ء میں کالج کی جانب سے چھاپی گئی۔

اس کتاب میں مورخ شبلی کی جھلک نظر آتی ہے ابوحنیفہؒ کے عقیدت مند ہونے کے باوجود وہ حقیقت کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور انھیں بشریت سے ماوراء کھانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ آپ نے تذکرہ نویسوں کے ایسے قصوں پر اعتراض کیا ہے۔

ہمارے تذکرہ نویسوں نے امام کے اخلاق و عادات کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں خوش اعتقادی اور مبالغے کا اس قدر رنگ بھرا ہے کہ امام صاحب کی اصلی صورت اچھی طرح پہچانی نہیں جاتی، چالیس برس تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی چالیس برس تک متصل روزے رکھے۔ جہاں وفات کی، اس جگہ سات ہزار بار قرآن ختم کیا۔ نہر کوفہ میں مشتبہ گوشت کا ٹکڑا پکڑا گیا اس خیال سے کہ مچھلیوں نے کھایا ہوگا اور مچھلیاں بہت دنوں تک زندہ رہتی ہیں۔ ایک مدت تک مچھلی نہیں کھائی..... ہمارے مورخین انھیں دوران کار قصوں کو امام کے کمالات کا جو ہر سمجھتے ہیں حالانکہ یہ واقعات نہ تاریخی اصول سے ثابت ہیں نہ ان سے کسی کے شرف پر استدلال ہو سکتا ہے۔^۹

سیرۃ النعمان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی نے ابوحنیفہؒ کو علم کے ہر میدان میں اعلیٰ و برتر ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی ہے ان کے بارے میں ایک مقام پر شبلی رقم طراز ہیں۔ ”مغازی، قصص سیر وغیرہ میں ان کی نظر چنداں وسیع نہ تھی۔“^{۱۰}

سید عبداللہ اس کتاب کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”سیرۃ النعمان اس موضوع پر بہترین کتاب ہے اس میں انھوں نے محبت اور عقیدت کے باوجود امام ابوحنیفہؒ کی صحیح تصویر پیش کی ہے۔“^{۱۱}

الفاروق:-

سیرۃ النعمان کے بعد شبلی نے الفاروق کے لکھنے کا کام شروع کیا اس کتاب کا سال تصنیف 1899ء ہے شبلی اس کتاب کو اپنی اب تک کی تصانیف میں سب سے بہترین سمجھتے تھے اور اسے انھوں نے اپنی غزل مرصع قرار دیا۔ المامون کے بعد مولانا شبلی الفاروق لکھنا چاہتے تھے مگر چند مجبوریوں کے تحت وہ ایسا نہیں کر سکے سید سلیمان کے نزدیک وہ مجبور یاں یہ تھیں کہ سر سید الفاروق لکھنے کے حق میں نہیں تھے وہ سمجھتے تھے کہ اس سے علی گڑھ کالج کے اتحاد و نقصان ہوگا اور سنی و شیعہ تفرقہ پیدا ہو جائے گا۔^{۱۲} مگر شبلی نے اس تالیف میں دیر ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ کوتاہ بینیوں نے عجیب عجیب بدگمانیاں کیں۔ حالانکہ بات اتنی تھی کہ بعض نادر کتابیں جو اس تصنیف کے لئے ضروری ہیں۔ اور یورپ میں چھپ رہی ہیں ابھی تک پوری چھپ کر نہیں آچکیں۔^{۱۳} یہ کتاب مولانا کی تحقیق و جستجو کا شاہکار ہے مولانا نے اس کتاب کے لیے صرف ہندوستان میں ہی مواد تلاش نہیں کیا بلکہ آپ نے اس کتاب

کا ذخیرہ جمع کرنے کے لیے بیرون ملک مصر و شام اور ترکی کے سفر میں وہاں کے کتب خانوں کی بھی سیر کی۔ اس کتاب کے لیے آپ نے طبری، کتاب الخراج عقد الفرید، مقریزی، بلاذری، فتوح البلدان، طبقات ابن سعد، سیرۃ العمرین امام جوزی، اخبار القضاۃ، محمد بن خلف اور محاسن الرسائل الی اخبار الاوائل جیسی مستند کتابوں کا مطالعہ کیا ان کتب کا حوالہ شبلی نے الفاروق میں دیا ہے۔

اس کتاب کے ذریعے مولانا نے حضرت عمرؓ کی شخصی عظمت کے ساتھ ساتھ ان کے سیاسی نظام کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ شبلی نے اس کتاب میں بھی حق کے دامن کو نہیں چھوڑا اور اپنے ہیر و کا اگر کوئی کمزور پہلو دکھائی دیتا ہے تو اسے بے جا استدلال سے اس کے دفاع کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ تاریخ نویسی کا یہی اہم ترین اصول ہے کہ کسی کی بے جا طرف داری کرنے کی جگہ حقیقی تصویر پیش کی جائے مثال کے طور پر جب حضرت عمرؓ پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے حضرت فاطمہؓ کو ان کے گھر میں آگ لگانے کی دھمکی دی تھی تو شبلی حضرت عمرؓ کو اس الزام سے بری کرنے کے لئے بے جا تاویلوں سے کام نہیں لیتے بلکہ کہتے ہیں کہ درایت کے اعتبار سے واقعہ کو نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ حضرت عمرؓ کی تندہی اور تیز مزاجی سے یہ حرکت کچھ بعید نہیں۔ ۱۴

شبلی نے اپنی کتاب میں حضرت عمرؓ کے عہد کے اداروں اور محکموں اور عہدوں کے لئے نئی اصطلاحوں کا استعمال کیا ہے مثلاً صاحب الخراج کو کلکٹر کا نام دیتے ہیں۔ شبلی کا ماننا ہے کہ جنگ و جدل کا نام تاریخ نہیں ہے بلکہ انسانی تہذیب و تمدن کے بیان کے بغیر تاریخ کی تصویر ناکمل ہے بقول سید عبداللہ ”اس کتاب میں شبلی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ صحیح تاریخ صرف جنگوں اور لڑائیوں کا نام نہیں ہے بلکہ اصل تاریخ تہذیب انسانی کا دوسرا نام ہے۔“ ۱۵

شبلی کی تصانیف میں سیرۃ النبی کے بعد الفاروق کو سب سے زیادہ مقبولیت ملی اور اسے علمی حلقہ میں کافی سراہا گیا۔

الغزالی

شبلی نے اپنے حیدر آباد کے قیام کے دوران الغزالی لکھی یہ کتاب 1903ء میں شائع ہوئی علم کلام پر لکھی جانے والی کتابوں کے تحت مولانا اس کی تیسری جلد میں آئمہ کلام کی سوانح لکھنا چاہتے تھے لیکن امام غزالی کے متکلمانہ خیالات سے ایسے متاثر ہوئے کہ جس طرح حکمرانوں میں مامون کو اور فقہاء میں امام ابوحنیفہ کو اپنا ہیرو بنایا تھا اسی طرح متکلمین میں امام غزالی کو اپنا ہیرو بنالیا اور ان پر پوری کتاب تحریر کر دی اور اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں نے امام صاحب کو فلسفی، متکلم اور اخلاق کے بہت بڑے معلم کی حیثیت سے اس کتاب کے ذریعے جانا اور پہچانا۔

سید عبداللہ کے نزدیک الغزالی فلسفہ کو مقبول بنانے کی ایک علمی کوشش ہے۔ ۱۶ اس کتاب میں امام غزالی کی ان کتب پر زیادہ توجہ دی گئی ہے جن کا تعلق فلسفہ سے ہے اس کتاب کے ذریعے شبلی علماء میں تصوف و فلسفہ کے خلاف پھیلی بدگمانیوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔

سید عبداللہ کے نزدیک کتاب کی فضا کچھ گھٹی گھٹی سی ہے لیکن اس کے لئے حیدر آباد کی فضا ذمہ دار ہے۔ ۱۷ جس کا اعتراف شبلی نے بھی کیا ہے ان کے اعتراف سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ الغزالی کو جس پایہ کی کتاب بنانا چاہتے تھے چند مجبوریوں کے تحت وہ ایسا نہیں کر پائے۔ لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود الغزالی کی اہمیت کم نہیں ہوتی اس کتاب میں شبلی نے امام غزالی کو ایک متکلم کی حیثیت سے پیش کیا ہے جو اردو میں اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔

سوانح مولانا روم:-

الغزالی کے بعد مولانا شبلی نے مولانا روم کی سوانح 1904ء میں لکھنا شروع کی چند ماہ میں یہ کتاب مکمل ہو گئی مگر مختلف وجوہات کی بناء پر 1906ء میں یہ کتاب منظر عام پر آ سکی۔ یہ کتاب مولانا نے حیدرآباد کے قیام کے دوران لکھی اس لئے یہ کتاب بھی سلسلہ آصفیہ میں شامل ہے۔ اس کتاب کا مقصد مولانا روم کو ایک متکلم کی حیثیت سے پیش کرنا ہے جس میں مولانا کا میاب ہوتے نظر آتے ہیں اس میں مولانا روم کی مثنوی کے عقائد اور علم الکلام کے پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔

سوانح مولانا روم کے لئے شبلی نے مناقب العارفین، کشف الظنون اور جواہر مدنیہ جیسی کتب کا مطالعہ کیا مگر زیادہ تر مواد سپہ سالار کی کتاب سے لیا ہے جو مولانا روم کے سوانح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ شاگرد بھی ہیں اس کتاب میں شبلی نے مولانا روم کی حالات زندگی اور ان کی مثنوی پر تفصیلی معلومات فراہم کی ہے اردو زبان میں یہ پہلی کتاب تھی جس میں مولانا روم کی مثنوی میں کلامیات کے پہلو پر روشنی ڈالی گئی۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر:-

اردو زبان میں تاریخ پر حقیقی کتابیں بہت کم لکھی گئی ہیں یہ رسالہ ان چند کتابوں میں سے ہے یہ رسالہ اورنگ زیب کے دفاع میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے یہ مضامین 1906ء سے 1908ء تک تسلسل سے اندوہ میں شائع کئے گئے تھے پھر ان مضامین کو کتابی شکل دے کر 1908ء میں شائع کیا گیا۔ اورنگ زیب کو بدنام کرنے کے لئے ایک بڑی مہم جاری تھی اور اس پر طرح طرح کے الزام لگائے جا رہے تھے اس کتاب میں ان تمام الزامات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر نے مولانا شبلی کو اس موضوع پر قلم اٹھانے کی صلاح دی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب محمد علی جوہر بڑودہ میں ملازم تھے اور شبلی نعمانی اس زمانے میں اپنے ہم سفر کے دوران بڑودہ گئے تھے۔ اس زمانہ قیام میں انھوں نے مولانا شبلی سے تحریک کی کہ وہ عالم گیر کے الزامات کی تحقیق و جواب میں مفصل مضمون لکھیں مولانا نے اس کو منظور کیا۔

اورنگ زیب پر لگے الزامات کے سلسلے میں انھوں نے جو دلیل دی ہیں وہ سیاسی نوعیت کی ہیں لیکن ان کا مذہبی رنگ بھی عیاں ہے۔ اورنگ زیب سے متعلق بعد میں جو دستاویز ملے ہیں اور جو اس وقت شبلی کو میسر نہیں تھے، ان کی بنیاد پر کئی باتوں میں ان کی تردید کی جاسکتی ہے۔ اس کتاب میں چند متنازع مسئلوں اور واقعات کو پرکھا گیا اور اصولی تعدیل اور مستند تاریخی حوالوں سے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نارواداری اور عہد شکنی کے جو الزامات اورنگ زیب پر لگائے گئے ہیں وہ سراسر بے بنیاد ہیں اور شیعہ و انگریز مصنفین نے قصداً واقعات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اورنگ زیب مجرم ٹھہرے۔

سیرۃ النبی:-

سیرت النبی مولانا شبلی کی مایہ ناز تصنیف ہے مولانا شبلی نے 1912ء میں یہ کتاب لکھنا شروع کی وہ اس کتاب کو کئی جلدوں میں لکھنا چاہتے تھے مگر اس کا پہلا حصہ ہی مکمل کر پائے اور دوسرے حصہ کے تکمیل کو پہونچنے سے پہلے ہی وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کے بعد ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے ان کے خواب کو مکمل کیا اور سات جلدوں میں یہ کتاب شائع ہوئی۔

مولانا شبلی نے اپنے علی گڑھ کالج کے ابتدائی دور میں ہی بدء الاسلام کے نام سے عربی میں ایک مختصر کتاب حضرت محمدؐ پر لکھی تھی جب 1906ء میں مولانا محمد علی جوہر نے انھیں ایک مکمل سیرت النبی لکھنے کی طرف متوجہ کیا تو مولانا اس کے لئے رضا مند ہو گئے لیکن مختلف وجوہات کی بناء پر مولانا اس کام کو شروع نہ کر سکے مگر 1912ء میں آپ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

مولانا شبلی کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ اس وقت ایک مجموعی اور مستند سیرۃ النبی کی کتاب کی اردو زبان میں بہت ضرورت تھی۔ ان کے نزدیک اس کی ضرورت مزید اس لئے اور بڑھ گئی کہ اردو میں سیرت پر کوئی مستند کتاب نہ تھی اس لئے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو سیرت پر کچھ جاننے کے لئے انگریزی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا جو تعصب رنگ آمیزی اور ناواقفیت کی وجہ سے غلطیوں سے پر تھیں۔ اس کتاب کی علمی حلقہ میں بے حد تعریف ہوئی۔ وقار عظیم کے مطابق آج تک سیرۃ النبی سے زیادہ محققانہ عمدہ اور جامع المعلومات کتاب رسول کریم پر نہیں لکھی گئی۔ ۱۸

اس کتاب کو لکھنے میں شبلی نے بہت زیادہ تحقیق و جستجو سے کام لیا جس کا اظہار انھوں نے خود کیا ہے۔ ”سیرت میں نہایت تنقید اور جانفشانی سے کام لے رہا ہوں اس لئے ہفتوں میں دو تین صفحے کا سامان ہاتھ آتا ہے۔“

شبلی نے اس کتاب کے لئے مستند کتابوں میں مواد تلاش کیا اور روایت و درایت کے اصولوں پر ہر بات کو پرکھا۔ سب سے پہلے وہ کسی بات کی سند قرآن میں تلاش کرتے ہیں۔ پھر صحیحین یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم اس کے بعد صحاح ستہ کی دوسری کتب میں اور سب سے آخر میں وہ سیرت کی کتب کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان میں اس فن کی ابتدائی کتب ان کے پیش نظر ہوتی ہیں معاملہ جتنا اہم ہوتا ہے وہ اس میں اتنی ہی تحقیق سے کام لیتے ہیں شبلی خود کہتے ہیں کہ انھوں نے واقعات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ایک اہم واقعات جن کی چھان بین کے لئے وہ بڑی جانفشانی سے کام لیتے ہیں اور دوسرے روزمرہ کے عام واقعات۔ اس کتاب کے ذریعے مولانا شبلی نے یورپین مصنفین کی غلط باتوں کی تردید بھی کی ہے یورپین مصنفین نے اپنی کتابوں میں حضرت محمدؐ پر اور اسلام پر کئی طرح کے الزام لگائے ہیں شبلی نے اپنی تحقیق و تعدیل سے ان الزامات کا جواب دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ یہ الزامات کس حد تک بے بنیاد ہیں۔

غرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیرت النبی ایک بے مثال کتاب ہے اردو زبان میں سیرت پر اس سے بہترین کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔

تاریخی مضامین

مولانا شبلی نے ان مستقل تصانیف کے علاوہ تاریخ کے موضوع پر مختلف مضامین بھی لکھے ان کے یہ مضامین اس وقت کے معروف رسالوں میں شائع ہوئے بعد میں جب سید سلیمان ندوی نے ان کے مضامین کو آٹھ جلدوں میں شائع کیا تو ان کے تاریخی مضامین کو جلد پنجم اور ششم میں شائع کیا۔ حصہ پنجم میں مندرجہ ذیل مضامین ہیں۔

- ۱- حضرت اسماء (اخلاق عربیہ)
- ۲- المعتز لہ والاعتزال
- ۳- ابن رشد
- ۴- علامہ ابن تیمیہ حرانی
- ۵- متنبی
- ۶- معیدان مجوس
- ۷- زیب النساء

- ۸- مولوی غلام علی آزاد بلگرامی
۹- فرید وجدی بک

جلد ششم میں درج مضامین کی فہرست کچھ اس طرح ہے

- ۱- تراجم
۲- کتب خانہ اسکندریہ
۳- اسلامی کتب خانے
۴- اسلامی حکومت اور شفا خانے
۵- ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر
۶- مسلمانوں کی علمی بے تقصی اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی
۷- میکسنس اور مسلمان
- شبلی کے یہ مضامین تاریخ کے مختلف موضوعات پر ہیں۔ ان میں کچھ مضامین تاریخی شخصیات پر ہیں۔ جیسے ابن رشد، علامہ ابن تیمیہ، زینب النساء اور حضرت اسماء۔ کچھ مضامین میں تاریخی مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ اور انکے ذریعہ کچھ غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسے ایک تحقیقی مضمون کتب خانہ اسکندریہ میں مولانا شبلی مسلمانوں پر عاید اس الزام کا کہ انہوں نے اسکندریہ کے کتب خانہ کو برباد کیا تھا جواب دیا ہے۔ اور تحقیق کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ اسے خود عیسائیوں نے نذر آتش کیا تھا۔
- ان کے تاریخی مضامین کے بارے میں اختر وقار کہتے ہیں۔ ”ان مضامین کے ہوتے ہوئے شبلی اگر کوئی اور تصنیفی کام نہ بھی کرتے تب بھی انہیں اردو میں تاریخ کا معلم اول سمجھا جاتا۔“ ۲۰

حوالے

- ۱- سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 1970ء، ص
۲- اختر وقار عظیم، شبلی بحیثیت مورخ، اعتقاد پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی 1977
۳- شبلی نعمانی، الفاروق، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 1956ء، ص 20
۴- ایضاً، ص
۵- سید عبداللہ، سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء کی نشر کا فکری اور فنی جائزہ، نئی لیتھو آرٹ پریس، نئی دہلی، ص
۶- مولانا شبلی نعمانی، المامون، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 2009ء، دیباچہ ص 3
۷- ایضاً، ص
۸- سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء کی نشر کا فکری اور فنی جائزہ، ص 165
۹- مولانا شبلی نعمانی۔ سیرۃ النعمان، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ص

- ۱۰- ایضاً، ص 101
- ۱۱- سرسید احمد خاں اور ان کے نامور فقہاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ، ص
- ۱۲- حیاتِ شبلی، ص 231
- ۱۳- سیرۃ العثمان، ص
- ۱۴- الفاروق، ص
- ۱۵- سرسید احمد خاں اور ان کے نامور فقہاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ، ص
- ۱۶- ایضاً، ص
- ۱۷- شبلی بحیثیت مؤرخ، ص 123
- ۱۸- ایضاً، ص 127
- ۱۹- شبلی بحیثیت مؤرخ، ص 83
- ۲۰- کتابیات
- ۱- احمد مفتون، مولانا شبلی نعمانی ایک مطالعہ، 1986 مکتوب اسلوب کراچی
- ۲- صدیقی، طفر احمد شبلی بحیثیت سیرت نگار، 2001، علی گڑھ
- ۳- عبداللہ سید، سرسید احمد خاں اور ان کے نامور فقہاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ، لیتھو آرٹ پریس، نئی دہلی
- ۴- عظیم، اختر وقار، شبلی بحیثیت مؤرخ، 1979 اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
- ۵- فاروقی، ضیاء الحسن، اشخاص و افکار 1973، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی
- ۶- ندوی، سید سلیمان، حیاتِ شبلی، 1970، دارالمصنفین، اعظم گڑھ
- ۷- نعمانی، مولانا شبلی، الفاروق، 195، دارالمصنفین، اعظم گڑھ
- ۸- نعمانی، مولانا شبلی، الغزالی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ
- ۹- نعمانی، مولانا شبلی، المامون، دارالمصنفین، اعظم گڑھ
- ۱۰- نعمانی، مولانا شبلی، سیرۃ النبی جلد اول، دارالمصنفین، اعظم گڑھ
- ۱۱- نعمانی، مولانا شبلی، سوانح مولانا روم، دارالمصنفین، اعظم گڑھ



ANWAR-E-TAHQEEQ

(Multilingual & Multidisciplinary Peer Reviewed Refereed Monthly Magazine from

Qila-e-Golconda, Hyderabad, Deccan)

Volume:-2, Issue:- 3,4,5 March, April, May 2016

Price: Monthly:-50rs., Annual:- 500rs.

Supervision

Syed Adil Ahmad, Department of Archaeology, state museum, Hyderabad Telangana

Editor: **Syed Ilyas Ahmad Madni**,

Address:-

9-10-389, Neem Bowli, Masjid, Kathora House, Golconda Fort, Hyderabad,

Telangana- 500 008

Mob:- 09966647580 Email:- anwaretahqeeq@gmail.com

Editorial Board

Dr. Shaid Naukhez Azmi, D/o,Persian,Manuu

Dr. Mohd. Aqeel, D/o, Persian, BHU

Dr. Sakina I Khan, HOD Persian, BU

Dr. Mohd. Qamar Alam, D/o, Persian, AMU

M. Tauseef Khan Kaker, D/o, Persian, AMU

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Editor, quaterly DABEER, Kakori, Lucknow

Arman Ahmad

Editor, quaterly Irfan, Chapra, Bihar

Atifa jamal

Editor Yearly Kokab-E-Naheed, Sandila

Sheikh Abdul Raheem, JIH, Hyderabad

Mutabbi Ali Khan, Daily Munsif, Hyderabad

Advisory Board

Prof. Masood Anwar Alavi, AMU, Aligarh

Prof. Umar Kamaluddin, LU, Lucknow

Prof. Syed Hasan Abbas, BHU, Varanasi

Prof. Azeez Bano, MANUU, Hyderabad

P. Anuradha Reddy, Intex, Telangana, Hyderabad

Dr. Zareena Perveen, Director of Archives, Hyd.

Dr. S. M. Asghar Abidi, AMU, Aligarh

Ahmad Ali, Keeper Manuscript, Salarjung, Hyd.

Dr. S. Asmath Jahan, MANUU, Hyderabad

Dr. M. A. Naeem, Hyderabad

M.A. Ghaffar, caleographer, AIwan-e-Urdu, Hyd.

Kishore Jhunjhunwala, Expert of coins, Mumbai

Amarbeer Singh, Expert of coins, Hyderabad